جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ



مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

جون، جولائی، اگست ۲۰۱۹ء، جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۶، ۷، ۸ سلسلہ نمبر ۱۸۱

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی

نائب مدیر

مولانا فضیل احمد ناصری

08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی

09997504588

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484

ای۔میل: ahmadanzarshah@gmail.com

اشتراک وتعاون

اندرونِ ملک:

فی شمارہ -/15 سالانہ -/150

خصوصی -/1000

تاحیات -/10000

بیرونِ ملک:

سالانہ: 20 امریکی ڈالر

خصوصی: 100 امریکی ڈالر

تاحیات: 500 امریکی ڈالر

Composed By: Huda Computers Deoband 9456422412

ورق درورق

صریر خامہ

عصریات

سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

لیجئے، ہر طرح کی بے یقینی، حالتِ زار اور گرتی ہوئی ساکھ کے باوجود مسندِ اقتدار پر پھر زعفرانی محاذ ہی آیا۔ کانگریس سمیت حزبِ اختلاف کے تمام ممبران اپنی والی ساری کوششوں کے باوجود وہیں رہ گئے، جہاں پہلے تھے۔ یوں ۲۰۱۹ء بھی ۲۰۱۴ء کی طرح بی جے پی کے لئے نویدِ بہار ثابت ہوا۔ ۲۳/۲۰۱۹ء مئی کو نتائج آئے اور حکومت ایک بار پھر نریندر مودی کی ہی بنی۔

انتخابات کے بعد نتائج جیسے بھی آئیں انہیں تسلیم کرنا ہی چاہئے۔ حالاں کہ ای وی ایم پر انگلیں اٹھتی رہیں، الیکشن کمیشن پر جانب داری کی آنچ بھی آئی، انتخابات میں عدم شفافیت کی بازگشت بھی سنائی دی، مگر آئین نے جسے حکومت سونپ دی، عوام کو اس کی تائید کرنی چاہئے۔ پچھلے پانچ برس بھاجپا کے لئے اچھے نہیں گئے۔ کئی وعدے بلکہ ۲۰۱۴ء کے الیکشن سے پہلے کے کئے گئے اکثر ہی وعدے جملے ثابت ہوئے، مزید برآں گرانیوں نے عوام کو آہ وفغاں میں مشغول رکھا۔ ججوں اور عدالت نے بھی بے اطمینانی کی کیفیت ظاہر کی۔ تین طلاقوں کے خلاف بل لانے کی کوششوں نے مسلمانوں کو پریشان کئے رکھا جو کہ اب تازہ ترین اطلاعات کے مطابق پارلیمنٹ سے پاس کرالیا گیا۔ ہجومی تشدد نے ساکنانِ وطن کا سکون غارت کر دیا، ان سب کے باوجود ملکی شہریوں نے ایک موقع بھگوا ٹولے کو اور دے ہی دیا ہے تو حکومت پر لازم ہے کہ عوام کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرے، اگر چہ اس کی توقع نہ ہونے کے درجے میں ہے۔ اچھے کارنامے ماضی کے سارے بدنما داغ پوری طرح دھو دیتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر حزبِ اقتدار نے پھر وہی قدیم روش جاری رکھی تو پرانے سارے زخم ہرے ہوتے رہیں گے اور ملک ترقی کے دوڑ سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔

❁❁❁❁

جن مذموم حرکتوں کا عوام کو خدشہ تھا، تجدیدِ حکومت کے بعد بالآخر وہ سامنے آ کر رہا۔ مودی حکومت نے دوسری میعاد کا آغاز ہی طلاقِ ثلاثہ کے ساتھ کیا۔ حزبِ اختلاف اور مسلمانوں کے ہزار دلائل کے باوجود کسی کی چلنے نہیں دی گئی۔ پھر رفتہ رفتہ وہی واقعات سر اٹھانے لگے جو ۲۰۱۴ء کے بعد سے مسلسل اٹھا

رہے تھے۔ہجومی تشدد ایک مرتبہ پھر تباہی کا عنوان بن گیا، مسلمانوں اور دلتوں کا اکیلے چلنا دشوار تر ہو گیا۔تبریز انصاری کے ساتھ دہشت گردی کی جو بھیانک واردات پیش آئی وہ ملکی سیاست کی جبیں پر ایک داغ بن چکی ہے۔نوجوان تبریز انصاری پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں جھارکھنڈ کا یہ نوجوان زخموں اور ضربوں کی تاب نہ لا کر آخر کار دم توڑ گیا۔اس عظیم سانحے کے بعد ملک کی بڑی چھوٹی ملّی اور رفاہی تنظیموں نے ریلیاں نکالیں، احتجاج کئے، حکومتوں کو خبردار اور مجرمین کو آگاہ کیا، اندازہ یہی تھا کہ اتنی مضبوط آوازوں کے بعد کام کے کام ہوں گے اور ظلم کے بادل چھٹیں گے، لیکن وائے ناکامی! یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جارہا ہے۔سفر محفوظ نہیں رہا، لوگ اکیلے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں۔حکمراں محاذ نے اس سے نمٹنے کے لئے قانون تو بنایا ہے، مگر اس پر جب تک سختی سے عمل نہیں ہوتا بے اطمینانی اور تشویش کی یہ فضا شاید ہی ختم ہو سکے۔

ہجومی دہشت گردی کے سلسلہ وار واقعات کے ساتھ ملکی سالمیت کو خطرہ ان جنونیوں سے بھی ہے جو دھمکی آمیز ویڈیو عام کر کے نفرت کی سوداگری کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص ویڈیو کے ذریعے صاف پیغام دے رہا ہے، اس کا چہرہ سامنے ہے، اس کے عزائم سامنے ہیں، لیکن اس کے خلاف کوئی حرکت نہیں۔

ویڈیو کے ذریعے ہتھیار تقسیم کرنے جیسی ناپاک حرکتیں بھی آئے دن ہو رہی ہیں، مگر انتظامیہ بے بسی کی تصویر بنا انہیں نظر انداز کر رہا ہے۔ہندوستان کے مسلمان اب باشعور ہو چکے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ بھگوا پارٹیوں کی ہزار اشتعال انگیزیوں کے باوجود وہ اپنے کام سے رکھے ہوئے ہیں، ورنہ اکسانے کی جیسی کوششیں چل رہی ہیں اگر یہ کامیاب ہو جاتیں تو ملک کو خانہ جنگیوں سے بچانا تقریباً ناممکن تھا۔

عوام جسے اپنا رہنما چنتے ہیں، ان سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں، مودی اینڈ کمپنی کو اگر ایک موقع اور دیا گیا ہے تو ان کی ذمہ داری ہے کہ مثبت انداز میں کام کر کے ملک کی تعمیر و تشکیل اور تزئین و آرائش کی طرف اپنی توجہات مبذول کریں۔عوام کی آرزوؤں کا خون کرنا کسی بھی حکومت کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

۞۞۞۞

شوال شروع ہوتے ہی حج کے ایام شروع ہو گئے، جن سعیدوں کے نام حج کے لئے قرعۂ فال نکلا تھا، ان میں سے بہت سے حجاج روانہ ہو چکے۔کچھ روانہ ہو رہے ہیں، اور کچھ حج کے قریب دنوں تک بیت اللہ پہنچ جائیں گے، حج ایک عظیم عبادت ہے، اسلام کے بنیادی ارکان میں شامل ہے۔اس عبادت میں جان بھی صرف ہوتی ہے اور مال بھی۔حاجیوں کے لئے قرآن وحدیث میں بڑی بشارتیں آئی ہیں۔پیغمبر علیہ السلام

نے فرمایا کہ: ''مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ وَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ'' جس نے حج کے معمولات اس طرح انجام دیئے کہ کوئی عمل خلافِ شریعت صادر نہیں ہوا، وہ اپنے وطن اس طرح لوٹے گا گویا اس کی ماں نے آج ہی جنم دیا ہو۔ حاجیوں کو اللہ کا مہمان کہا گیا ہے۔ مسلمان بارادۂ حج جب زمینِ حجاز پر قدم رکھتے ہیں تو اپنے عزیز و اقارب اور خاندان کو بھول کر خوشنودئ الٰہی میں کھو جاتے ہیں۔ پھر وہ وظائف انجام دیتے ہیں کہ اگر کسی دوسری جگہ وہی کام کئے جائیں تو خود شریعت انہیں وعیدیں سنائے۔ سادہ اور بے سلے لباس کے ساتھ صفا و مروہ کی سعی، خانۂ کعبہ کا طواف در طواف، منیٰ کا قیام، مزدلفہ کی رہائش، جمرات کی رمی، پھر قربانی وغیرہ۔ صاف لگتا ہے کہ حاجی خدا کی تلاش میں اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے۔ اللہ کو یہ ادائیں اس قدر محبوب ہیں کہ حاجیوں کی ہر ہر نیکی پر اجرِ عظیم سے نوازتے ہیں۔

لیکن عبادات اس وقت تک اپنا اثر نہیں دکھاتیں جب تک کہ نیت بخیر اور ارادہ نیک نہ ہو۔ حج بلاشبہ ایک عظیم عبادت ہے، مگر اس کے بھی اپنے مطالبات ہیں۔ اس کا تقاضہ ہے کہ بداعمالیوں سے پُر پچھلی زندگی سے سدا کے لئے کنارہ کش ہو جائیں۔ حج کے بعد زندگی میں وہ انقلاب آئے کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھیں اور انہیں بھی اسلامی و قرآنی زندگی گزارنے کی رغبت ملے۔ جھوٹ، فریب، وعدہ خلافی اور دیگر ساری معاشرتی و اخلاقی کمزوریاں دور کی جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا حج قبول ہوا۔ ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ عام اسفار کی طرح یہ بھی ایک سفر ہی رہا۔

۞۞۞۞

عیدالاضحیٰ آ رہی ہے۔ عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کی عید۔ اس میں مسلمان قربانی کا فریضہ انجام دیں گے۔ یہ وہ مقبول ترین عبادت ہے کہ ایامِ قربانی میں اس سے زیادہ اور کوئی عمل مقبول نہیں۔ قربانی ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہے۔ خاتم النبیین حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ھی سنة ابیکم'' ابراہیم پھر یہ بھی فرمایا: سَمِّنُوْا ضَحَايَاكُمْ فَإِنَّهٗ عَلَى الصِّرَاطِ مَطَايَاكُمْ۔ اپنے قربانی کے جانور کو خوب صحت مند بناؤ کیوں کہ پل صراط پر وہی تمہاری سواری بنیں گے۔

قربانی کی یہ عبادت ساڑھے چودہ سو برس سے مسلمانانِ عالم مسلسل ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ اس فریضے کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ گائے تو ہمارے یہاں قانوناً ممنوع ہے، اس لئے بھینس اور بکری وغیرہ کی قربانی کر کے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ اللہ عزوجل سے دعاء ہے کہ وہ سارے مسلمانوں کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور ہماری زندگی میں اسلام کی بہار چلا دے۔

مسلمانوں کو عید مبارک باد دینے کے ساتھ ان سے خصوصی گزارشات بھی ہیں۔سب سے پہلی گزارش یہی کہ قربانی انہیں جانوروں کی کریں جن کی ہمارے ملک میں اجازت ملی ہوئی ہے۔دوسری گزارش یہ ہے کہ پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیں۔ذبح کرتے وقت کی تصویریں ہرگز نہ بنائیں۔انہیں سوشل میڈیا میں نشر نہ کریں۔اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جانور اور اس کے گوشت کی تصویر نہ بھیجیں۔قربانی کا گوشت لے کر ایسی جگہ ہرگز نہ جائیں جہاں جاتے ہوئے دشواریوں اور پریشانیوں کا اندیشہ ہو۔سفر کرتے وقت وہ لباس ہرگز نہ پہنیں جس پر خون کے دھبے لگے ہوں۔ملک کے حالات انتہائی خراب ہیں۔دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو ستانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔امن کے دشمن تیار کھڑے ہیں،آپ کی ذراسی چوک سنگین رخ اختیار کر سکتی ہے۔

عالمِ اسلام کو ایک بار پھر عیدِ قرباں کی مبارک باد!!

۞۞۞

نازک امانت

از: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

’’آج مسلمانوں کی قوت ایمانی کا بھی امتحان ہے، اور ذہانت کا بھی، قوت فیصلہ کا بھی امتحان ہے، اور زندگی کی صلاحیتوں کا بھی، ہم کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ایمان کے ساتھ زندہ رہنے کے اہل ہیں یا نہیں، ہم جہاں رہیں اس ملک کی خصوصیات اپنے اندر خوشی سے پیدا کریں، وہاں کی زبانیں سیکھیں، اور بچوں کو پڑھائیں، اپنا حصہ رسدی حاصل کریں، ملک کے نظم ونسق (ایڈمنسٹریشن) میں اپنے شایان شان حصہ لیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ داعی بھی رہیں، مومن بھی رہیں، توحید کا اعلان بھی کریں، اور پیغام پہنچانے والے بھی بنیں، خدا کے یہاں ہم سے سوال ہوگا کہ اللہ نے ہم کو سیکڑوں برس اس ملک میں باقی رکھا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کا دین کیوں ہمارے اندر محدود رہا، اس کو پھیلنا اور وسیع ہونا چاہیے تھا۔‘‘ (اسلام مکمل دین مستقل تہذیب: ۳۴-۳۵)

مغرب کی فکری یلغار کی بنیاد اور اس کا علاج

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

سیرت نبوی کا ایک اہم اور مشہور واقعہ معراج کا ہے، جو مشہور روایت کے مطابق ماہِ رجب میں پیش آیا، معراج کے موقع پر جو باتیں پیش آئیں، ان میں ایک اہم بات یہ تھی کہ جب آپ ﷺ اس سفر آسمانی سے واپس ہوئے اور اگلی صبح اپنی چچازاد بہن حضرت ام ہانیؓ سے اس کا ذکر فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ یہ قصہ اہل مکہ سے نہیں کہیں؛ کیوں کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں گے، حضرت ام ہانی کو خوب اندازہ تھا کہ یہ حقیقت ناشناس لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام غیبی کو سمجھنے سے قاصر ہیں، جب وہ اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے تو بھلا اس بات کا کیا یقین کریں گے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے راتوں رات مکہ مکرمہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے عالم بالا پر لے جائے گئے؛ اس لئے انہوں نے سوچا کہ اہل مکہ کی طرف سے تمسخر کا ایک دروازہ کھل جائے گا۔

لیکن چوں کہ نبی کے لئے یہ بات ضروری ہوتی تھی کہ ان کو جن غیبی حقائق کو ظاہر کرنے کا حکم دیا جائے، وہ ان کو ظاہر کر دیں؛ اس لئے آپ ﷺ کعبۃ اللہ تشریف لے گئے اور اس سفر آسمانی کا اہل مکہ کے سامنے ذکر فرمایا، ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا، لوگوں نے ٹھٹھا کیا، مذاق اڑایا، خود ہنسے، دوسروں کو ہنسایا، تمسخر اور استہزاء کے تیر پر تیر پھینکے، آخر کچھ دشمنان اسلام کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابوبکرؓ کو اسلام کی دعوت سے دور کرنے کا بہترین موقع اور مناسب وقت ہے؛ چنانچہ انہیں خبر دی گئی، پہلے ان سے حجت تمام کرنے کے لئے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ ایک ہی رات میں اس نے مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر طے کیا ہے تو کیا اس پر یقین کرو گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے حسب توقع جواب دیا کہ یہ تو بالکل اور ناقابل یقین بات ہے، مکہ والوں کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں تھی، انہیں یقین ہو گیا کہ اب ہم محمد ﷺ سے ان کے سب سے بڑے مددگار اور غمگسار کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس لئے انہوں نے اب ان سے کہا کہ یہ کسی اور کا نہیں؛ بلکہ آپ کے رفیق خاص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بیان ہے، حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے فرمایا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی ہے تو پھر یہ بات درست ہے؛ کیوں کہ ہم نے کبھی اپنی آنکھوں سے فرشتہ کو نہیں دیکھا؛ لیکن ہم آپ کے کہنے کی وجہ سے اس پر یقین رکھتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس غیبی سفر کا یقین نہیں کریں، پھر ہوا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بیت المقدس کے درمیان پردے اٹھا دیے گئے، سارے مناظر آپ کی نگاہوں کے سامنے آ گئے، حضرت ابو بکرؓ لوگوں کی زبان بندی کے لئے سوالات کرتے گئے، اور آپ ﷺ ان کا جواب دیتے رہے، یہاں تک کہ معترضین کی زبانیں گنگ ہوگئیں؛ لیکن جن کے دل مریض تھے اور جنہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ کفر ہی پر قائم رہیں گے اور سچائی کو قبول نہیں کریں گے، ان کی ضد نے انہیں تاریکی سے روشنی کی طرف آنے نہیں دیا، یہ ایک بہت بڑا کردار ہے جو سیدنا حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے قیامت تک آنے والی امت کے لئے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے، ان کے اسی عمل نے انہیں ''صدیق'' کا لقب دلایا، اور اسی باعث امت آپ کو صدیق اکبر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

یہ واقعہ زبان زدعام وخاص ہے، اور جن لوگوں کو تھوڑی بہت دینی معلومات بھی ہے، وہ بھی اس سے واقف ہیں، جلسوں میں بار ہا یہ واقعہ ذکر کیا جاتا ہے، اور لوگ محبت وعقیدت کے کانوں سے سنتے ہیں؛ لیکن کم لوگ ہیں جو اس واقعہ کی گہرائی پر غور بھی کرتے ہیں، اس واقعہ سے ہم ایمان کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو جہاں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک عقل وفہم بھی ہے، یہ عقل ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان فضاء کی بلندیوں کو ناپ رہا ہے، اس نے چاند اور مریخ پر اپنے قدم رکھ دیے ہیں، اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو فتح کرلیا ہے؛ اسی لئے اسے اپنے عقل پر بہت ناز ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ہمیں عقل کے فتویٰ پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے، عقل جس بات کو قبول کرے، وہ قابل قبول ہے، اور جو بات عقل کے لئے ناقابل قبول ہو، وہ ایک واہمہ ہے، جس چیز کو انسان اپنی آنکھوں سے یا اپنی مشینوں سے دیکھ سکے، وہ موجود ہے، اور انسان کی آنکھیں جن چیزوں کا ادراک نہ کرسکیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ عقل اور مشاہدہ کی سرحدیں جہاں ختم ہوجاتی ہیں، وہاں سے اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام شروع ہوتا ہے، اسی غیبی نظام کے تحت ہم خدا پر، وحی کے نظام پر، انبیاء وملائکہ پر، جنت ودوزخ پر اور آسمانی کتابوں پر یقین رکھتے ہیں، بحیثیت مسلمان ہمارا یقین ہے کہ آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں، زبان چکھنے میں غلطی کرسکتی ہے، ہاتھوں کا ادراک غلط ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کان سننے میں غلطی کرجائے؛ لیکن جو بات اللہ نے فرمائی ہے اور جو بات اللہ کے رسول نے کہی ہے، وہ غلط نہیں ہوسکتی، یہ اٹوٹ یقین ہی

ایمان کی بنیاد ہے، کوئی شخص کس قدر بھی پابندِ صلاۃ ہو، زکوٰۃ ہی نہیں صدقہ وخیرات بھی دیتا ہو، اس نے بار بار حج بھی کیے ہوں، لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ بھی بہتر ہو؛ لیکن جو باتیں یقینی طور پر دین کے سرچشموں یعنی قرآن وحدیث سے ثابت ہوں، اگر ایسے کسی چھوٹے سے چھوٹے امر کا انکار کردے تو اعمال کی اس کثرت کے باوجود انسان دولت ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے بار بار وضاحت کی کہ کسی عمل کے جائز و ناجائز ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ انسان اس کی مصلحت کو سمجھ جائے، اور عقل اس کا ادراک کرلے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو کسی مسلمان مرد یا عورت کو اس معاملہ میں کسی بات کا اختیار باقی نہیں رہتا، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔ (احزاب:۳۶)؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے، ان کی عقلی حکمت و مصلحت کا ذکر نہیں فرمایا؛ حالانکہ خدائے حکیم کا کوئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ احکام شریعت کو اس لئے ماننا ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے؛ اس لئے نہیں کہ یہ ہماری عقل کے مطابق اور ہماری مصلحتوں سے ہم آہنگ ہے، مثلاً اسلام سے پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کرنے اور سود لینے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، سود دینے والے کا پیسہ ایک مدت تک سود لینے والے کے پاس رہتا ہے، وہ اسی مدت کا عوض سود کی شکل میں حاصل کرتا ہے، تاجر بھی اپنا پیسہ لگا کر مال خرید کرتا ہے، اور اس کا مال فروخت ہونے میں ایک مدت لگ جاتی ہے، گویا وہ جو کچھ نفع لیتا ہے وہ اسی مدت کا معاوضہ ہوتا ہے، قرآن مجید اس کی تردید کرنے کے لئے تجارت اور سود کے معاشی فوائد ونقصانات پر روشنی ڈال سکتا تھا؛ لیکن قرآن مجید نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، اور فیصلہ سنادیا کہ یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے؛ کیوں کہ اللہ نے تجارت کو حلال رکھا ہے اور سود کو حرام اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ ۲۷۶)۔

اسی طرح اہل مکہ کہا کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں سے جانور ذبح کرے تو وہ حلال، اور جو جانور مردار ہو، جس کو اللہ نے مارا ہو وہ حرام، یہ بات ظاہر ہے کہ ذبح کئے ہوئے جانور سے فاسد خون نکل جاتا ہے، اور وہ انسان کی صحت کے لئے نقصاندہ نہیں ہوتا؛ جبکہ مردار کے جسم میں فاسد خون رک جاتا ہے، اور اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اس اعتراض کا یہ جواب دیا جاسکتا تھا؛ لیکن قرآن مجید نے ان حکمتوں اور مصلحتوں پر کوئی گفتگو نہیں کی اور صاف طور پر کہہ دیا کہ اللہ کا حکم ہے کہ جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ، فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام:۱۱۸) اور جس کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اسے مت کھاؤ وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ (الانعام:۱۲۱) قرآن مجید نے اپنے اس اسلوب کے ذریعہ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ عقل اللہ تعالیٰ

کی بہت بڑی نعمت ہے، اوراسلام اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بار بار سوچنے، سمجھنے اور فکر کرنے کی دعوت دی ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان عقل کو اپنا معبود بنالے، اور جن چیزوں کے بارے میں اللہ کا فیصلہ موجود ہے، ان کے بارے میں بھی عقل کو حاکم تصور کرنے لگے، بہ قول علامہ اقبال:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

اس وقت مغربی تہذیب کی عالم اسلام اور مسلم نوجوانوں پر جو یلغار ہے، اس کی دو بنیادیں ہیں، ایک یہ کہ جو بات عقل میں آئے، اسے قبول کرو، اور جس بات کو ہماری عقل قبول نہ کرے، اسے خاطر میں نہیں لاؤ، چاہے وہ بات مذہبی صحیفہ ہی میں کیوں نہ آئی ہو، یہ کیا بات ہے کہ مرد کو طلاق کا حق ہو اور عورت کو نہ ہو، یہ کیا ظلم ہے کہ مرد تو ایک سے زیادہ نکاح کرے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہو، یہ کیسا انصاف ہے کہ بیٹے کے مقابلہ میں بیٹی کو آدھا حصہ ملے، ایسا کیوں ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں اور دونوں ہی کے چہرے میں کشش رکھی گئی ہے؛ لیکن مردوں کے لئے تو پردہ ضروری نہ ہو اور عورتوں کے لئے ضروری ہو، اس کا کیا فائدہ ہے کہ قربانی کے لاکھوں جانور ایک ہی دن تہہ تیغ کردیے جائیں، بجائے اس کے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پسماندگی کو دور کیا جائے، حج کے سفر پر کثیر رقم خرچ کر دی جاتی ہے، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی سوالات ہیں، جو اس بنیاد پر اٹھائے جاتے ہیں کہ انسان کی عقل کوتاہ جب تک کسی بات کو قبول نہ کرلے، وہ قابل قبول نہیں سمجھتا۔

دوسری بنیاد ہے شہوت پرستی، انسان کو جو بات اچھی لگے، وہ اس کے مطابق عمل کرے، ان کے نزدیک خدا کے قانون کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انسان کی خواہش میں رکاوٹ پیدا کرے، انسان کو شریعت کا نہیں لذت کا غلام ہونا چاہئے، جس بات سے انسان کو لذت حاصل ہو، انسان اس کو کرنے کے لئے آزاد ہے، آج مغربی دنیا میں کیسے کیسے ناشائستہ اور غیر فطری کاموں کو جواز بخشا جارہا ہے، ہم جنس سے تعلق کی اجازت، ایک ہی جنس کے لوگوں کا آپس میں نکاح، عریانیت کی عمومی اجازت، سود کی حوصلہ افزائی، ان سب کا حاصل یہی ہے کہ انسان کی خواہش پر کوئی کنٹرول نہیں ہونا چاہئے، وہ اپنی خواہشات پر عمل کے لئے آزاد ہے، اور خود اپنی مرضی کا مالک ہے۔

مغربی تہذیب کی یہ دونوں بنیادیں دراصل اسی تصور پر مبنی ہیں کہ انسان کو نظام غیبی کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے؛ بلکہ حق وباطل اور صحیح وغلط کے سارے فیصلے خود کرنا چاہئے۔

واقعہ معراج کے موقع سے حضرت ابوبکرؓ کا اسوۂ صدیقی ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنی نسلوں کا مزاج بنائیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے حکم کو اپنی عقل سے بالاتر سمجھیں، وہ اس بات کا یقین کریں کہ حق وباطل کا پیمانہ نہ انسان کی عقل ہے نہ وہ مصلحت ہے جو احاطہ دماغ میں آجائے، نہ اس کی خواہش ومرضی ہے، نہ اس کا معیار لذت ہے کہ جو چیز باعث لذت ہو اسے لے لیا جائے، اور جو چیز لذت اندوزی میں حارج ہو، اسے ٹھکرا دیا جائے، جب تک ہم مسلمانوں کی نئی نسل کی یہ سوچ نہیں بنائیں گے، مغرب کی طرف سے تہذیبی ارتداد، فکری انحراف اور تشکیکی اندازِ فکر کی جو بیماری لانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔

۞۞۞

تعلیم وتبلیغ کرنے والوں کو خلوت میں ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ بھی ضروری ہے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾: یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو (دوسری) محنت کے لیے تیار ہوجایئے، وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ اور دعا و استغفار میں لگ جائیں۔ اکثر حضرات مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ بعض حضرات نے دوسری تفسیریں بھی لکھی ہیں مگر اقرب وہی ہے جو اوپر لکھی گئی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت وتبلیغ اور خلق خدا کو راستہ دکھانا، ان کی اصلاح کی فکر یہ آپ کی سب سے بڑی عبادت تھی مگر یہ عبادت بواسطۂ مخلوق ہے کہ ان کی اصلاح پر توجہ دیں اور اس کی تدبیر کریں۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ صرف اس عبادت بالواسطہ پر آپ قناعت نہ کریں بلکہ جب اس سے فرصت ملے تو بلاواسطہ خلوت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں، اسی سے ہر کام میں کامیابی کی دعا کریں کہ اصل مقصود جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ ذکر اللہ اور عبادت بلاواسطہ ہی ہے اور شاید اسی لیے پہلی قسم یعنی عبادت بالواسطہ سے فراغت کا ذکر فرمایا کہ وہ کام ایک ضرورت کے لیے ہے، اس سے فراغت ہوسکتی ہے اور دوسرا کام یعنی توجہ الی اللہ ایسی چیز ہے کہ اس سے فراغت مومن کو کبھی نہیں ہوسکتی بلکہ اپنی ساری عمر اور توانائی کو اس میں صرف کرنا ہے۔ (معارف القرآن، جلد ۸)

صحاح ستہ کے مؤلفین کی اغراضِ تالیف

مولانا عبدالرشید نعمانیؒ

صحیحین، سنن اور دیگر مفصل کتب حدیث مختلف اصولوں کے پیش نظر مختلف مقاصد کے لئے مرتب کیے گئے، بعض کی ترتیب میں صرف سند کی مضبوطی کا اہتمام کیا گیا تو سخت شرائط کے التزام کی وجہ سے متن کامل نہ ہوئے۔ صحیح بخاری کو اصح الکتب سند کے اسی عالی معیار کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور اس التزام کی وجہ سے اس میں متن اور ترتیب ایسی ہے جو عامی آدمی تو کجا عام عالم کیلئے بھی استفادے سے مانع بن جاتی ہے۔ امام بخاری کی بعض دیگر کتب مثلاً الادب المفرد اور دیگر مصنفین کی صحاح مثلاً صحیح مسلم وغیرہ اس اعتبار سے صحیح بخاری سے زیادہ نافع ہیں۔ اسی طرح بعض نے متون مکمل کیے، بعض نے اطراف ومتابعات پر کام کیا جبکہ بعض محدثین نے یہ کیا کہ ہر روایت بلا شرط جمع کر دی۔ اس طرح یہ مجموعات وجود میں آئے۔

عظیم محدث امام مسلم رحمہ اللہ نے اصول حدیث کے شہرہ آفاق اصول ماخذ مقدمۂ مسلم میں اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ ان مجموعات کے مقاصد مختلف تھے، کوئی سند محفوظ کرنے کیلئے وجود میں آیا، کوئی متون اور کوئی تمام روایات۔ اب جو عام علماء ہیں وہ صرف ان مجموعات سے استفادہ کریں جو صحیح ہیں اور جو راسخین فی العلم ہیں وہ ہر طرح کے مجموعات دیکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ حقائق روایت سے واقف ہیں اس لئے ان کی گمراہی کا خطرہ نہیں۔

صحاح ستہ کے مؤلفین کی اغراض تالیف

امام بخاریؒ

امام بخاریؒ کی غرض تالیفِ احکام اور استنباطِ مسائل ہے، بعض مرتبہ استنباط اس قدر دقیق ہوتا ہے کہ روایت اور ترجمۃ الباب میں مطابقت کے لیے دقتِ نظری سے کام لینا پڑتا ہے۔ امام بخاریؒ بسا اوقات پوری حدیث ایک جگہ نہیں نقل کرتے، بلکہ مختلف مواقع پر اس کے وہی ٹکڑے ذکر کرتے ہیں جس سے وہاں

حکم مستنبط ہورہا ہے۔امام بخاریؒ کے تراجم آپ کی دقت نظر اور تفقہ کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لیے مشہور ہے: **فقه البخاری فی تراجمه**۔ (امام بخاریؒ کی فقہ ان کے تراجم میں ہے) اس کے دو مطلب ذکر کیے گئے ہیں: ایک مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا مسلک اور فقہی رجحان ان کے تراجم سے آشکارا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ امام بخاریؒ کی دقتِ نظری اور ذکاوت ان تراجم سے واضح ہوتی ہے۔یعنی فقہ یا تو اپنے معروف معنی میں ہے یا ذکاوت اور دقتِ نظری کے معنی میں ہے، چنانچہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں:

"فقه البخاری فی تراجمه, و لهذا القول عند شیخنا محملان, الأول أن المسائل التی اختارها من حیث الفقه تظهر من تراجمه, والثانی أن تفقهه وذکاء ه ودقة فکره یظهر فی تراجمه" (معارف السنن ۱/۲۳)

امام مسلمؒ

امام مسلم کا وظیفہ صحیح احادیث کا جمع کرنا ہے، چنانچہ وہ ایک موضوع کی حدیث کو اس کے تمام صحیح طرق کے ساتھ ایک جگہ مرتب شکل میں جمع کر دیتے ہیں، استنباط سے ان کی کوئی غرض متعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب کے تراجم ابواب بھی انھوں نے خود قائم نہیں کیے، بلکہ بعد کے لوگوں نے حواشی میں بڑھائے ہیں۔ ہمارے موجودہ ہندوستانی نسخے میں قائم کردہ عنوانات امام نوویؒ کے ہیں۔

امام نسائیؒ

آپ کا مقصد زیادہ تر عللِ اسانید بیان کرنا ہے، چنانچہ وہ احادیث کی عللِ خفیہ پر "هٰذا خطأ" کہہ کر متنبہ کرتے ہیں۔ پھر وہ حدیث لاتے ہیں جو ان کے نزدیک صحیح ہو، اس کے ساتھ استنباطِ احکام پر بھی ان کی نظر ہوتی ہے۔

امام ابوداوٗدؒ

ان کا وظیفہ مستدلاتِ ائمہ بتلانا ہے، اس لیے وہ ان احادیث کو تمام طرق کے ساتھ یکجا ذکر کر دیتے ہیں، جن سے کسی فقیہ نے کسی بھی فقہی مسئلہ پر استدلال کیا ہو، اس لیے وہ امام مسلمؒ کی طرح صحیح احادیث کی پابندی نہیں کر سکے، البتہ "قال أبو داؤد" کے عنوان سے وہ ضعیف اور مضطرب احادیث پر کلام کرنے کے بھی عادی ہیں۔

امام ترمذیؒ

امام ترمذی کا مقصد اختلافِ ائمہ کو بتلانا ہے، اس لیے وہ ہر فقیہ کے مستدل کو جداگانہ باب میں ذکر کر

کے ان کا اختلاف نقل کرتے ہیں۔ ہر باب میں عموماً صرف ایک حدیث لاتے ہیں اور باقی احادیث کی طرف وفی الباب عن فلان وفلان کہہ کر اشارہ کر دیتے ہیں۔

امام ابن ماجہؒ

ابن ماجہ کا طریقہ امام ابوداؤدؒ کے مشابہ ہے۔فرق یہ ہے کہ اس میں صحیح اور سقیم ہر طرح کی احادیث آ گئی ہیں۔(دیکھیے: مقدمہ درس ترمذی ۱/ ۱۲۷)

اس لیے علماء نے لکھا ہے ''ہر حدیث پڑھنے والے کو سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس حدیث کے متعلق ائمہ کیا کہتے ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے؟ یہ بات ترمذی سے معلوم ہوگی۔اس کے بعد جب مذہب معلوم ہو گیا تو اب ضرورت ہے کہ اس کی دلیل معلوم ہو، وہ وظیفہ ابوداؤد کا ہے۔اس کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ کیسے مستنبط ہوا؟ یہ وظیفہ بخاریؒ کا ہے کہ وہ استنباطِ مسائل کا طریقہ دکھلاتے ہیں اور بتلاتے ہیں۔اس کے بعد جب احادیث سے مسائل مستنبط ہو گئے اور دلائل سامنے آ گئے تو ان دلائل کی تقویت کے لیے اسی مضمون کی دوسری حدیث کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یہ کمی امام مسلمؒ پوری کرتے ہیں، اب آدمی مولوی ہو جاتا ہے۔اب اس کے بعد اس کو محقق بننے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ یہ معلوم کرے کہ یہ حدیث جو مستدل بن رہی ہے، اس کے اندر کوئی علت تو نہیں، اس کا تعلق نسائی سے ہے۔اس کے بعد آدمی کو ایک مستقل بصیرت حاصل ہو جاتی ہے، اب اس کو چاہیے کہ وہ احادیث پر غور کرے اور خود دیکھے کہ اس حدیث کے اندر کوئی علت تو نہیں، کیوں کہ نسائی شریف کے اندر تو خود امام نسائیؒ ساتھ دے رہے تھے اور بتلاتے جاتے تھے کہ اس حدیث میں یہ علت ہے، لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بغیر کسی کے مطلع کیے ہوئے خود احادیث کو پرکھے اور علل کو تلاش کرے، اس کے اندر معین ابن ماجہ ہے، کیوں کہ اس میں احادیث گڈ مڈ ہیں اور کسی کے متعلق یہ نہیں بتلایا گیا ہے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے، انہی اغراض کے پیش نظر ہمارے اکابر نے مذکورہ بالا ترتیب قائم فرمائی تھی''(سراج القاری، ج۱، مقدمہ الکتاب، ص: ۵۳)

احادیث کی تعداد کے بارے میں ایک مغالطہ

منکرین حدیث یہ اعتراض کرتے ہیں کہ موجودہ حدیث کی کتابوں میں چند ہزار سے زائد احادیث کی تعداد پائی نہیں جاتی اور محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم نے لاکھوں حدیثوں سے ان کا انتخاب کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ احادیث کی بڑی تعداد خود محدثین کے بیانات کے مطابق خود ساختہ ہے لہٰذا ایسی صورت

میں ان چند ہزار کا بھی کیا اعتبار رہ جاتا ہے کہ جن کو لاکھوں موضوعات سے چھانٹ کر صحیح قرار دیا گیا ہو۔

یہ ایک بہت ہی بڑا سنگین مغالطہ ہے جو بیچارے ناواقف عوام کو دیا جارہا ہے، کیونکہ محدثین کے یہاں تو احادیث کی تعداد کا حساب ان کی اسانید کے اعتبار سے ہوتا تھا نہ کہ متون کے لحاظ سے، پس اگر کسی حدیث کی مثلاً سوا سانیدیں ہیں تو اس کی تعداد اپنی اسانید کے اعتبار سے سو ہو گی چنانچہ حدیث **إنما الاعمال بالنّیات** کا جب شمار لگائیں گے تو اس کی سات سو اسنادوں کے اعتبار سے سات سو شمار کریں گے۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چھانٹ کر صحیح بخاری کو مرتب کیا ہے تو اس سے مراد چھ لاکھ متن نہیں بلکہ مختلف طرق اور سندوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اس لیے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب محدثین احادیث کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد متون احادیث نہیں بلکہ طرق و اسانید ہوتے ہیں، نیز سلف کا دستور تھا کہ وہ آثار صحابہ و تابعین اور ان کے فتاوے کے لئے بھی حدیث کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے، چنانچہ حافظ سخاوی، فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

’’و کذا آثار الصحابة و التابعین و غیرھم و فتاؤھم مما کان السلف یطلقون علی کل حدیثا۔‘‘

(ص ۱۲ طبع انوار محمدی لکھنؤ) اور اسی طرح اس تعداد میں (مکررات و موقوفات کے علاوہ صحابہ و تابعین وغیرہ کے آثار و فتاویٰ بھی داخل ہوتے ہیں) کیونکہ ان میں سے ہر ایک کیلئے متقدمین حدیث کا لفظ استعمال کرتے تھے، اس کے بعد سخاوی لکھتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ہیں کہ جو سو سو سندوں کے ساتھ مروی ہیں اور حدیث **إنما الاعمال بالنیات** کے متعلق تو حافظ ابو اسماعیل انصاری ہروی سے منقول ہے کہ انہوں نے حدیث مذکور کو اس کے صرف ایک راوی یحییٰ بن سعید انصاری سے ان کے سات سو شاگردوں کی سند سے لکھا ہے۔

۞۞۞

قربانی

جذبۂ اطاعت کا عملی پیکر

مولانا ندیم الواجدی صاحب، فاضل دیوبند

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر خوشی اور مسرت کے اظہار کے لیے دو دن عطا کیے ہیں، ان میں سے ایک عیدالفطر ہے جو رمضان کے اختتام پر آتی ہے، اور دنیا بھر کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پر کہ اس نے رمضان المبارک میں اپنی عبادت کی سعادت عطا کی بہ طور شکر خالق کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اور دوسرا عیدالاضحیٰ کا دن ہے، یہ دن ایک عظیم واقعے کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ ایک عظیم تاریخی دن ہے، آج ہی کے دن اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں ذبح کیا تھا، اللہ رب العزت کو اپنے پیغمبر کی یہ قربانی اس قدر پسند آئی کہ ان کا جگر گوشہ بھی صحیح سلامت قربان گاہ سے واپس آیا، اور اس دن کو ایک قومی یادگار بھی بنا دیا گیا۔ قیامت تک مسلمان اس واقعے کی یادگار کے طور پر اپنے رب کی بارگاہ میں قربانی پیش کرتے رہیں گے۔

قربان عربی کا لفظ ہے۔ یہی لفظ اردو میں قربانی بن کر استعمال ہوتا ہے، قربان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو قرب خداوندی کے حصول کا ذریعہ ہو، خواہ وہ چیز جان دار ہو، یا بے جان، اسی لیے اس عمل صالح کو بھی قربان کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ کی رحمت سے قریب ہونے کی نیت کی جائے، شریعت کی اصطلاح میں اس ذبیحے کو قربانی کہتے ہیں جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قربانی کا تصور نیا نہیں ہے، بلکہ یہ تخلیق کائنات کی ابتدا سے چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی، ہابیل نے کچھ بھیڑیں اور قابیل نے کچھ غلہ قربان

کیا، ان دونوں کی قربانیوں کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی رد کردی گئی۔ سابقہ مذاہب میں قربانی کی قبولیت کے لیے یہ علامت مقرر کردی گئی تھی کہ آسمان سے آگ کا شعلہ لپکتا اور قربانی کے لیے رکھی ہوئی چیز کو خاکستر کردیتا۔ اس سے سمجھ لیا جاتا تھا کہ فلاں شخص کی قربانی قبول کر لی گئی ہے۔ اور جس شخص کی قربانی جوں کی توں باقی رہ جاتی اس کے متعلق یہ یقین کرلیا جاتا کہ اس کی قربانی مسترد کردی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے ایک قربان گاہ بنائی جس میں قربانی کرنے کے لیے جانور رکھے جاتے تھے۔ شریعت موسوی میں بھی قربانی کا رواج تھا، عیسائیوں میں قربانی کا دستور نہ تھا، البتہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کی قربانی دے کر سارے عالم کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا ہے۔ سب سے بڑی قربانی جس کا ذکر قرآن کریم میں نہایت صراحت کے ساتھ موجود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی تھی، جنھوں نے ایک خواب کی بنیاد پر اپنے عزیز بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کردیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کا ذکر قرآن کریم کی سورۂ الصافات کی آیات (۱۰۲-۱۱۰) میں اس طرح موجود ہے کہ جب حضرت اسماعیل کچھ بڑے ہوگئے اور وہ اپنے والد کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کررہا ہوں، آپ نے اس خواب کو محض خواب سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے حکم الٰہی سمجھا، کیوں کہ انبیاء کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں، اب ضروری تھا کہ باپ اپنے بیٹے سے خواب کا ذکر کریں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بتلایا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ جیسے میں تمھیں ذبح کررہا ہوں، اب تم بتلاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے خواب سنتے ہی کسی توقف کے بغیر کہا کہ ابا جان آپ تعمیل حکم میں تاخیر نہ کریں، میں ذبح ہونے کے لیے تیار ہوں۔ تصور کیجیے اس وقت باپ بیٹے کے دلوں کی کیا کیفیت ہوگی، ایک طرف باپ کے دل میں بیٹے کی فطری محبت اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کہ اس عزیز بیٹے کو ہماری خوشی کے لیے قربان کردو۔ بیٹا بھی کس قدر فرماں بردار اور اطاعت شعار کہ اس نے ذرا ملال نہیں کیا، نہ رویا پیٹا نہ واویلا کیا بلکہ خوشی خوشی اپنے والد کے خواب کی تعبیر بننے کے لیے آمادہ ہوگیا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم فرشتوں کے ذریعے بھی دیا جاسکتا تھا جیسا کہ عموماً فرشتے ہی وحی الٰہی انبیائے کرام تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ لیکن خواب میں ذبح کا منظر

دکھلانے کے پیچھے بہ ظاہر یہ حکمت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب میں جو حکم دیا جاتا ہے اس میں نفس انسانی کے لیے تاویلات کی بڑی گنجائش ہوتی ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی طرح کی کوئی تاویل نہیں کی بلکہ حکم الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، پھر باپ نے بیٹے سے اس کی رائے معلوم کی۔ یہ استفسار کسی تردد کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اپنے بیٹے کو آزمانا تھا کہ اس کی تربیت پیغمبرانہ اصولوں کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں؟ نیز اس کے دل میں حکم الٰہی کے آگے سرنگوں ہونے کا جذبہ پوری طرح موجود ہے یا نہیں؟ یوں بھی انبیاء علیہم السلام اگر چہ اطاعت حکم کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن ان کا طرز عمل سہولت اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو کچھ کہے بغیر ذبح کرنے لگتے تو یہ دونوں کے لیے مشکل کا سبب ہوتا، یوں بھی کسی کو غفلت میں مار دینے اور کسی کا برضا و رغبت جان کا نذرانہ پیش کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کامل اطاعت اور مکمل جذبۂ انقیاد کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ باپ بیٹے دونوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو کہ ان کا عمل اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے سے سب کچھ صاف صاف بتلا دیا، اور بیٹے نے بھی پیغمبرانہ اولوالعزمی کا ثبوت دیا، اور بلا توقف عرض کیا یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (الصافات: ۱۰۲) ''ابا جان آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کریں'' یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ بیٹے نے اپنے والد بزرگوار کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھا، اور اسی لیے انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ وہ اس حکم پر بلا چون و چرا عمل کریں۔

اس جملے سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دل میں جاں سپاری کا بے پناہ جذبہ موجود تھا، اور وہ کمسنی کے باوجود اپنی جان قربان کرنے کے لیے بہ خوشی راضی ہو گئے، وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نوعمری کے باوجود کہ ابھی صرف تیرہ برس کے تھے نہایت ذہین بھی تھے، اور یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے والد اللہ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبروں کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں کسی حکم الٰہی کا حوالہ نہیں دیا تھا بلکہ محض اپنا خواب بیان کیا تھا، بیٹا جان بچانے کو یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ابا جان یہ محض خواب ہے، آپ اسے خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیں، مگر انھوں نے نہ کوئی تردد کیا نہ کسی تاویل کا سہارا لیا، نہ باپ کو غمزدہ کرنے کی کوشش کی، بلکہ خوشی خوشی قربان گاہ کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دیئے ''سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ

الصّٰبِرِيْنَ ۝ ‘‘ (الصافات: ۱۰۲) آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے‘‘۔ اس جملے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے انتہائی ادب اور کمال تواضع کی جھلک ملتی ہے۔ ایک طرف تو انھوں نے ان شاء اللہ کہہ کر معاملے کو اللہ کے حوالے کر دیا، اور دعویٔ صبر میں عُجب و پندار کی متوقع آمیزش کا خاتمہ کر ڈالا۔ دوسرے یہ نہیں کہا کہ مجھے آپ صبر کرنے والا پائیں گے۔ بلکہ یہ کہا کہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ گویا صبر وضبط میرے ہی ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اللہ کے اور بھی بندے ہیں جو ایسے سخت حالات میں صبر وضبط کا دامن تھامے رہتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اسی حُسنِ ادب کو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں کس قدر شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اس کے بعد قرآن کریم نے اس واقعے کی منظر کشی نہیں کی جس کا ذکر کیا جا رہا ہے، یہ تو بتلایا کہ دونوں باپ بیٹے اللہ کے حکم کی تعمیل میں سرنگوں ہو گئے، اور انھوں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اس خواب کو حقیقت کا پیرہن پہنا کر رہیں گے، فَلَمَّآ اَسْلَمَا (الصافات: ۱۰۳)’’ان دونوں نے سرِتسلیم خم کر دیا‘‘ یہاں لفظ لمّا مذکور ہے، قاعدے میں اس کا جواب آنا چاہیے کہ آخر سرِتسلیم خم کرنے کے بعد کیا واقعہ پیش کیا، کس طرح باپ نے اپنے نور نظر کی گردن پر چھری چلائی، اور کس طرح بیٹے نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی، مفسرین نے لکھا ہے کہ جواب لمّا اس لیے مذکور نہیں کہ باپ بیٹے کی فدائیت کا منظر اتنا عظیم اور اتنا عجیب وغریب تھا کہ الفاظ میں ان کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی، بعض مجرد حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، محض محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ بے نظیر واقعہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

تفسیری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لختِ جگر کو لے کر چلے تو راستے میں تین جگہ شیطان نے انھیں بہکانے اور ورغلانے کی کوشش کی، تینوں مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات سات کنکریاں مار کر اسے بھگا دیا، عرفات سے واپسی کے بعد منیٰ میں آج تک تینوں جمرات پر اسی ادائے ابراہیمی کی یاد کے طور پر شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں، شیطان کو دھتکارتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کے ساتھ قربان گاہ پہنچے، اور حکم پر عمل کی تیاری شروع کی، فرماں بردار بیٹے نے عرض کیا کہ ابا جان آپ مجھے اچھی طرح باندھ دیجیے

تاکہ میں زیادہ نہ تڑپوں، کہیں میرا اضطراب اور تڑپ دیکھ کر آپ بے چین نہ ہوجائیں، آپ دامن کو بھی سنبھال کر رکھئے کہیں وہ میرے خون سے تر نہ ہوجائے، اور آپ کے خون آلودہ کپڑے دیکھ کر میری امی کو غم نہ ہو، اپنی چھری کی دھار بھی تیز کر لیجیے تاکہ وہ جلد سے جلد میرا گلا کاٹ ڈالے، اور میرا دم آسانی کے ساتھ نکل جائے، میری امی کو میرا سلام کہیے اور میرا یہ کرتا انھیں دیدیجیے تاکہ ان کے بے چین اور مضطرب دل کے لیے وجہ سکون بن سکے۔ بیٹے کی یہ گفتگو باپ نے سنی، اُن کے دل کی کیفیت کیا رہی ہوگی، ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے، شاید ہی کوئی شقی القلب انسان ایسا ہوگا جس کا کلیجہ یہ الفاظ سن کر شق نہ ہو، یقینا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر بھی غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہوگا، مگر وہ کوہِ استقامت بن کر کھڑے رہے، اور بیٹے سے فرمایا کہ تم کتنے اچھے ہو کہ خدا کے حکم کی تعمیل میں میری مدد کررہے ہو، یہ کہہ کر انھوں نے بیٹے کی پیشانی چومی اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور اوندھے منھ لٹا دیا، اسی کو قرآن کریم نے ان دو لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے: وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (الصافات: ۱۰۳) ''اور بیٹے کو کروٹ کے بل لٹادیا''۔ بعض روایات میں ہے کہ پہلے انھیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری گردن پر پھیری اور اس نے اپنا کام نہیں کیا تو بیٹے نے کہا ابا جان آپ منہ کے بل لٹادیجیے، ایسا لگتا ہے کہ میرا چہرہ آپ کی نظروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے ہاتھ پوری قوت سے کام نہیں کررہے ہیں، اس کے بعد انھیں اوندھے منھ لٹایا اور گردن پر چھری چلادی، لیکن چھری نے اپنا عمل نہیں کیا، حکم الٰہی کے بغیر چھری کی کیا مجال تھی کہ وہ گردن کاٹ دیتی، آسمان سے آواز آئی، بس بہت ہوا، تم نے اپنا خواب سچ کردکھایا، تم دونوں اس آزمائش میں پورے اترے، اصل مقصود امتحان محبت ووفاداری لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تو نہیں رکھتے، آج کے عمل سے ثابت ہوگیا واقعی تمھارے دل میں صرف ہماری محبت ہے، بیٹے کے بجائے اس مینڈھے کی قربانی کرو۔ یہ واقعہ قرآن کریم کی ان آیات میں مذکور ہے: وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۙ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ (الصافات: ۱۰۴-۱۰۷) ''ہم نے ان کو پکار کر کہا کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ ثابت کردکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا تھا''۔

تاریخ میں یہ واقعہ ایک نادر واقعے کے طور پر یاد رکھا گیا۔ تمام آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر

موجود ہے، قرآن کریم نے بھی اس کو اپنے خاص دعوتی اور اصلاحی اسلوب میں بیان فرمایا ہے، مختلف مذاہب میں قربانی کا جو تصور ملتا ہے انھوں نے اسی عظیم الشان واقعے سے روشنی اور رہ نمائی حاصل کی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے باقاعدہ ایک سنت پیغمبری کے طور پر زندہ رکھا اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ہر سال مخصوص ایام میں قربانی کریں اور وفاداری اور جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں، فرمایا: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ ؕ (الکوثر: ۲) ''اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے''۔

قربانی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے شعائر اسلام میں سے قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم میں ہے:

وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (سورۃ الحج: ۳۶-۳۷)

''قربانی کے اونٹ اور گائے اور اسی طرح بھیڑ بکری کو بھی ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے، ان (جانوروں) میں تمھارے فائدے ہیں، سو تم ان پر کھڑے کر کے (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا کرو، پھر جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں) تو تم خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے اور نہ کرنے والوں کو بھی کھانے کو دو، اور ان (جانوروں) کو اس طرح تمھارے زیر حکم کر دیا تا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارے لیے مسخر کیا ہے، تا کہ تم (اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے) اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجیے''۔

شعائر اُن امور کو کہتے ہیں جن سے اسلام کی عظمت اور شوکت ظاہری ہوتی ہے اور جن کی حفاظت ضروری ہے، ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی روح تقویٰ ہے، نہ خون بہانا اہم ہے اور نہ گوشت کھانا، جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے یہاں نہ ان جانوروں کا گوشت پہنچے گا اور نہ ان کا خون، صرف تقویٰ پہنچے گا۔ تقویٰ کیا ہے؟ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

صاحبؒ نے ایک وعظ کے دوران ارشاد فرمایا ''قربانی کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے۔ صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے، اور تقرب الی اللہ ہے تو ظاہر ہے یہ روح بغیر جانور ذبح کیے کیسے حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ نے جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنی پڑے گی، تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی، یہی تقویٰ ہے۔'' (خطبات حکیم الاسلام: ۲/۳۹۱)

یہ ہے قربانی کی وہ صورت واقعہ جس سے ذبح اسماعیل کا اقدام جذبۂ اطاعت کا عملی پیکر بن گیا اور اس شان سے بنا کہ جب تک دنیا میں اللہ کا نام لیا جاتا رہے گا صبر و استقامت، اور ایثار و قربانی کا یہ عملی پیکر بھی روشن اور تابندہ رہے گا۔

❁❁❁

کثرت تصنیف، امت محمدیہؐ کی خصوصیت

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ فرماتے ہیں

"قرآن کا یہ اعجاز بھی ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثرت تصنیف اس امت کی خاصیت ہے، اتنی تصانیف دنیا کی کسی امت میں نہیں ہوئیں جتنی اس میں ہیں، ملکوں میں کتب خانے بھرے پڑے تھے اور ہر کتاب کو دیکھو وہ قرآن کی کسی ایک آیت کی تشریح اور تفسیر ہے، حجاز کے کتب خانوں میں لاکھوں کتابیں ہیں، مصر کے کتب خانوں کو دیکھو سو برس سے مصری حکومت چھاپتے چھاپتے عاجز ہوگئی مگر مصر شہر کی کتابوں کا عشر عشیر بھی ابھی نہیں چھپ سکا، اندلس کے اتنے کتب خانے تھے کہ جب مسلمانوں کا قبضہ اٹھا اور پھر عیسائیوں نے قبضہ کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کے لٹریچر کو تباہ کر دو، جب تک یہ لٹریچر باقی ہے، ان میں روح ایمان باقی رہے گی تو عیسائی حکومت نے مستقلاً ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے کتب خانے تباہ کئے جائیں، اس کے لئے ایک مستقل عملہ بنایا گیا جو سارے کتب خانوں کو آگ لگا دے، جلا دے، تلف کر دے، اس کا ایک انچارج آفیسر مقرر کیا، تو لکھتے ہیں بچاس برس میں اندلس کے کتب خانے کہیں مٹ سکے ہیں۔" (خطبات حکیم الاسلام ج 1 ص 200، 201)

دورِ حاضر کی
بعض ناجائز تجارتی صورتیں

مفتی محمد جعفر ملّی رحمانی

اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

"اے رسولو! پاکیزہ نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، بلاشبہ میں تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہوں"

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے تمام انبیاء اور پیغمبروں کو اپنے اپنے وقت میں دو ہدایتیں دی ہیں؛

(۱) حلال و پاکیزہ کھانا کھاؤ۔ (۲) نیک وصالح عمل کرو۔

ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان کا غیر طیب وغیر پاکیزہ غذا کھانا اور غیر صالح عمل کرنا ممکن نہیں، تو انہیں حکم دے کر درحقیقت ان کی امتوں کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ وہ ان دو چیزوں کا اہتمام کریں۔

علماء کرام نے ان دونوں حکموں کو ایک ساتھ ذکر کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ حلال غذا کا عملِ صالح میں بڑا دخل ہوتا ہے، جب انسان کی غذا حلال و پاکیزہ ہوتی ہے، تو اسے نیک اعمال کی توفیق خودبخود ہونے لگتی ہے، اور اگر غذا حرام ہو تو نیک کاموں کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اسے اس میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں، اور وہ نیک کاموں سے دور ہی رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حلال آمدنی وکمائی کے لیے محنت وکوشش کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض قرار دیا، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حلال کمائی کا طلب کرنا فرض ہے"

آج ہمارے معاشرہ کا بگاڑ وفساد جودن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے، اور اصلاح ودرستگی کی تمام

کوششیں بے سود ثابت ہو رہی ہیں، اس کی جہاں بہت ساری وجوہ ہیں، ان میں سے ایک اہم ترین وجہ یہ ہے کہ ہم حلال آمدنی وحلال کمائی کی طرف اتنی توجہ نہیں دے رہے ہیں جتنی دینی چاہیے، مسلمانوں کا تاجر طبقہ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ وہ جن چیزوں کی تجارت کر رہا ہے، شریعت کی نگاہ میں ان کی خرید وفروخت جائز ہے بھی یا نہیں؟ اور تجارت کی کون سی صورتیں درست ہیں اور کون سی ممنوع، مثلاً:

۱-موجودہ دور میں زمین کی خرید وفروخت

آج کل زمینوں کی خرید وفروخت بڑے پیمانے پر اس طرح کی جارہی ہے کہ خریدار، مالکِ زمین سے زمین کا سودا کر لیتا ہے، اور بیعانہ کے طور پر اسے کچھ رقم دیدیتا ہے، جسے مارکیٹنگ کی زبان میں "ٹوکن" سے تعبیر کرتے ہیں، پھر پوری قیمت کی ادائیگی اور خریدی رجسٹری کے لیے ایک مدت متعین ہوتی ہے، مدت پوری ہونے پر خریدار پوری رقم دے کر مالکِ زمین سے اپنے نام زمین کی خریدی رجسٹری کرواتا ہے، مگر اس مدت کے درمیان خریدار، اس زمین کی خریدی رجسٹری اپنے نام پر ہونے سے پہلے ہی اسے کسی تھرڈ پارٹی (Third Party) کے ہاتھوں منافع کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے، اور اس سے حاصل کردہ رقم سے مالکِ زمین کا پورا پیمینٹ ادا کر دینے کے بعد جو رقم بچتی ہے اسے منافع کے طور پر رکھ لیتا ہے، یعنی ابھی یہ زمین اس کی ملک میں آئی بھی نہیں کہ اس سے پہلے ہی وہ اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، شریعت اس طرح کی بیع کو ناجائز کہتی ہے؛ کیوں کہ اس طرح کی بیع میں دھوکہ اور غَرَر ہے، وہ اس طرح کہ ہوسکتا ہے خریدار پارٹی مدت پوری ہونے سے پہلے مفلس وکنگال ہوجائے، اور زمین دار کو وقت پر مقررہ قیمت نہ ادا کر سکے، جس کی وجہ سے یہ بیع پوری نہ ہو پائے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ مدت پوری ہونے سے پہلے خود زمین دار کی مدتِ عمر پوری ہوجائے، اور زمین پر اس کے ورثاء کے نام چڑھ جائیں، اور وہ اس زمین کو فروخت نہ کریں، جس کی وجہ سے یہ بیع پوری نہ ہو پائے، معلوم ہوا کہ بیع کی یہ صورت دھوکہ اور غرر پر مشتمل ہے، جس سے شریعت منع کرتی ہے۔(احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۲۱۹)

بندے نے زمینوں کا کاروبار کرنے والے کئی لوگوں کو اس ناجائز صورت کی طرف متوجہ کیا، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پارٹی نمبر وَن (First Party) یعنی مالکِ زمین سے اسٹامپ بنوالیتے ہیں اور اس اسٹامپ کی بنیاد پر تھرڈ پارٹی کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں، میں نے ان سے پوچھا:

"کیا اس اسٹامپ کی حیثیت انتقالِ ملک کی ہے؟ یعنی کیا اس اسٹامپ کے ذریعہ خریدار زمین کا مالک بن جاتا ہے، اور زمین، زمین دار کی ملک سے نکل کر خریدار کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے؟ تو ان کا جواب یہ تھا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اسٹامپ کی حیثیت محض اتنی ہے کہ اس میں مذکور مدت پوری ہونے کے بعد خریدار پیمینٹ کی ادائیگی، اور زمین دار خریدی دینے کا مکلف و پابند ہوتا ہے"۔

ان کے اس جواب کے لحاظ سے اسٹامپ پیپر (Stamp Paper) محض وعدۂ بیع (Agreement to sale) ہوا، نہ کہ بیع، اور وعدۂ بیع سے نہ تو بیع پوری ہوتی ہے اور نہ ہی مبیع (زمین) پر خریدار کی ملک ثابت ہوتی ہے، تو اسے تھرڈ پارٹی کے ہاتھوں فروخت کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، جب کہ شریعت غیر مملوکہ وغیر مقبوضہ (Without Owned and Possessed) کی بیع سے منع کرتی ہے، جب بیع کی یہ شکل جائز نہیں ہے، تو اس کے منافع بھی جائز نہیں ہوں گے، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے: "الخراج بالضمان" (خراج ضمان کے سبب ہے)۔ یعنی کسی بھی چیز کے منافع کا جواز، ضمان اور رسک کی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے، جب کہ بیع کی اس صورت میں زمین خریدار کے ضمان اور رسک میں داخل ہی نہیں ہوتی، اور وہ اس سے پہلے ہی اسے تھرڈ پارٹی کے ہاتھوں بیچ کر منافع کماتا ہے، تو یہ منافع کیسے جائز ہوں گے!!

اسی طرح بعض سرمایہ دار مشارکت (Partnership) میں اپنا سرمایہ اس شرط پر لگاتے ہیں کہ وہ ہر مہینہ ایک متعینہ رقم کے بطور نفع کے حقدار ہوں گے، خواہ نفع کچھ بھی ہو، یا یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ کاروبار میں ہونے والے نقصان کے ذمہ دار نہیں ہوں گے، پارٹنر شپ کی یہ صورت بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ پارٹنر شپ کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک فریق کے لیے نفع کی ایک خاص مقدار متعین نہ کی جائے (بلکہ متوقع نفع میں فیصد کو متعین کیا جائے)، اور شریک و پارٹنر کاروبار میں ہونے والے نقصان میں بھی اپنے سرمایہ کے تناسب سے شریک ہو۔ (فتاوی عثمانی :۳/۳۵)

۲- ایم ایل ایم (M.L.M) یعنی ملٹی لیول مارکیٹنگ

آج کل ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جو مختلف اسکیموں کو ممبر در ممبر آگے بڑھاتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ادارہ ایک آدمی کو ممبر بناتا ہے، اس سے پانچ سو روپئے فیس لیتا ہے، اور اس ممبر شپ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس ادارہ کی مصنوعات (Product) مثلاً: کوئی چیز جس کی قیمت بازار

میں پچاس روپے ہیں، تو وہ چیز اسے چالیس روپے میں ملتی ہے، اور اس پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ مزید پانچ ممبر تیار کریں، اگر وہ ایک آدمی کو ممبر بنادے تو ادارہ اس کو دو سو روپے دیتا ہے، اور جب پانچ ممبر ہوجائیں تو اسے مزید آٹھ سو روپے یعنی کل ایک ہزار روپے ملتے ہیں، اسی طرح ادارہ ہر نئے ممبر سے پانچ سو روپے ممبری فیس وصول کرتا ہے، اور اس پر بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ پانچ ممبر بنائے، اور اس ممبر بنانے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے، اب جب بھی ادارہ میں نئے ممبر کا اضافہ ہوتا ہے، ادارہ کو بلامحنت ومشقت مفت میں تین سو روپے، اور پہلے ممبر کو بلاعوض دو سو روپے کا فائدہ ہوتا ہے، اس طرح کی اسکیم کھلم کھلا قمار بازی (جوا) ہے، اور اس میں سود بھی پایا جاتا ہے؛ اس لیے یہ بھی شرعاً ناجائز وحرام ہے۔

۳-تجارتی انعامی اسکیمیں

(۱) کبھی کوئی کمپنی یہ طے کرتی ہے کہ جو ہم سے اتنے اتنے روپے کا سامان خریدے گا، ہم اس کو عمرہ کرائیں گے، یا ہم اس کو ڈرائیور سمیت گاڑی فراہم کریں گے، جس پر وہ فلاں فلاں مقامات کی سیر وتفریح کے لیے جاسکتا ہے۔

(۲) اسی طرح کبھی کوئی کمپنی اپنی مصنوعات (Product) فروخت کرنے والے دکانداروں سے، یا کوئی دکاندار اپنے خریداروں سے یہ کہتا ہے کہ اگر اتنا اتنا سامان خریدوگے، تو ہم تم کو کوپن دیں گے، پھر ان دکانداروں اور خریداروں کے درمیان قرعہ اندازی ہوتی ہے، جن کے نام قرعہ نکلتا ہے وہ انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

(۳) کبھی کوئی کمپنی یا دکاندار اپنے خریداروں سے یہ کہتا ہے کہ جو بھی ہم سے اتنا سامان خریدے گا، ہم سب کو انعام دیں گے، لیکن یہ انعام مالیتوں کے اعتبار سے مختلف ہوں گے، جن کا تعین قرعہ اندازی سے ہوگا۔

اس طرح کی تجارتی انعامی اسکیموں کے ذریعے خریداروں کو انعام کی لالچ دے کر انہیں بے جا فضول خرچی اور غیر ضروری خریداری کی طرف راغب کیا جاتا ہے، اور متعلقہ کمپنی اور دکاندار پوری ہوشیاری کے ساتھ ایسے حربے اپناتے ہیں کہ لاکھوں خریداروں میں سے محض کچھ خریداران کے اس انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں، اور دوسرے خریداروں کے لیے سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، نیز کاروبار کے اس طریقہ کے پیچھے جوئے اور قمار ہی کی روح کارفرما ہوتی ہے، اس لیے شرعاً یہ ناجائز

ہے۔(فتاوی عثمانی: ۳/ ۲۵۵، جدید فقہی مسائل: ۴/ ۲۷۶، المسائل المہمۃ: ۱/ ۱۳۳)

۴-گولڈ مائن انٹرنیشنل اسکیم

اسی طرح کی ایک اسکیم "گولڈ مائن انٹرنیشنل"(Gold mine international) نامی کمپنی نے پوری دنیا میں پھیلا رکھی ہے، اس کمپنی کا طریقہ کاروبار نیٹ ورک مارکیٹنگ کی طرح ہے، جو مختلف مصنوعات اور سونے کے سکے بھی تیار کر کے فروخت کرتی ہے، کمپنی اپنی تمام مصنوعات کی تشہیر لوگوں میں لوگوں ہی کی زبانی کراتے ہوئے اپنے نئے گاہک (Customers) بنانے کا کام بھی معقول معاوضے کے عوض لوگوں سے لیتی ہے، اس طرح لوگ کمپنی کو نئے گاہک فراہم کرتے ہیں اور کمپنی لوگوں کو اس کے بدلے کمیشن ادا کرتی ہے۔ گرچہ یہ دلالی ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس دلالی کے لیے "GMI" کمپنی کی کوئی چیز مثلاً گھڑی یا کوئی اور پراڈکٹ (Product) خریدنا ضروری ہے، یہ اجارے میں شرطِ فاسد ہے، اس کے علاوہ اس اسکیم میں اور دوسری خرابیاں بھی موجود ہیں، جن کی وجہ سے شرعاً یہ ناجائز ہے۔

۵-"جیونا" کمپنی اسکیم

آج کل "جیونا" نام سے ایک کمپنی قائم ہے، جس کی اسکیم یہ ہے کہ پینتیس سو روپے دیکر اس کے ممبر بن جاؤ اور ان ساڑھے تین ہزار کے عوض کمپنی کوئی شئی نہیں دے گی؛ لیکن اگر یہ ممبر کم سے کم مزید دو ممبر کمپنی کے لیے بنا دیتا ہے، یعنی یوں کہیے کہ کمپنی کو سات ہزار روپے دوسرے دو فردوں سے لا دیتا ہے، تو کمپنی اسے اس میں سے بطورِ کمیشن چھ سو روپئے ادا کرے گی اور اگر ان دو ممبروں میں سے ہر ممبر دو دو ممبر بناتا ہے، تو جہاں ان دو ممبروں کو چھ چھ سو روپئے بطورِ کمیشن ملیں گے، وہیں پہلے ممبر کو مزید بارہ سو روپئے ملیں گے، یعنی کل اٹھارہ سو روپئے ملیں گے اور اگر یہ چار ممبروں میں سے ہر ممبر دو دو ممبر بناتا ہے، تو ان میں سے ہر ایک کو چھ چھ سو اور پہلے کو گذشتہ کے اٹھارہ سو میں مزید چوبیس سو روپئے ملا کر، یعنی کل بیالیس سو روپئے دیئے جائیں گے اور جیسے جیسے یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا ویسے ویسے پہلے ممبر کو بھی ہر ممبر پر کمیشن ملتا رہے گا۔ اسکیم کی یہ صورت جوا اور باطل طریقہ سے لوگوں کے اموال کھانے کی حرمتِ صریحہ پر مشتمل ہے، اس لیے اس طرح کی اسکیموں کا ممبر بننا اور بنانا دونوں عمل شرعاً ناجائز وحرام ہے اور اس پر ملنے والا کمیشن بھی حرام ہے؛ اس لیے اس طرح کی اسکیموں میں شرکت سے کلی اجتناب ضروری ہے۔

۶-غرر وقمار پر مشتمل ایک ممبر ساز اسکیم

آج کل عموماً تاجر یا کمپنی وغیرہ ممبر سازی کے ذریعہ فریج، کولر، واشنگ مشین، سائیکل، موٹر سائیکل وغیرہ اسکیم کے تحت فروخت کرتے ہیں، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کی اصل قیمت بازار میں مثلاً: پانچ ہزار روپے ہیں، تو وہ لوگ پوری رقم یکبارگی لینے کے بجائے، سو روپے ماہانہ ادا کرنے والے سو ممبر پینتالیس ماہ کے لیے بنالیتے ہیں، اور ہر ماہ پابندی کے ساتھ قرعہ اندازی کی جاتی ہے، اگر پہلے ہی ماہ میں کسی ممبر کا نام قرعہ اندازی سے نکل آتا ہے، تو اس کو صرف سو روپے میں پانچ ہزار کی چیز مل جاتی ہے، اور اگر کسی کا نام دوسرے ماہ میں نکلا تو پانچ ہزار کی چیز اسے صرف دو سو میں مل جاتی ہے، اسی طرح ہر ماہ قرعہ اندازی میں نام نکلنے والے کو وہ چیز جمع شدہ رقم کے عوض ملتی رہتی ہے ، اب پینتالیسویں ماہ میں جتنے ممبر باقی رہیں گے، سب کو وہ چیز دیدی جائے گی، اس طرح کی اسکیم شرعاً قمار (جوا) کو شامل ہے، نیز بوقتِ عقد، ثمن مجہول ہوتا ہے، لہذا یہ اسکیم چلانا، اس میں حصہ لینا، اور قرعہ اندازی سے طے شدہ اشیاء کا حاصل کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

۷-کمی بیشی کے ساتھ چیک کی خرید وفروخت

بسا اوقات تاجر حضرات آپس میں نقد روپیوں کی بجائے چیک سے لین دین کیا کرتے ہیں، چیک کے بھنانے میں چونکہ وقت لگ جاتا ہے اور تاجر کو فوری نقد روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ چیک میں لکھی ہوئی رقم سے کم میں، کسی اور کے ہاتھ اس چیک کو فروخت کردیتا ہے، خریدار وقتِ مقررہ پر اس چیک کو بھنا لیتا ہے، اور اپنی اصل رقم اضافہ کے ساتھ رکھ لیتا ہے۔شرعاً اس طرح چیک کی خرید وفروخت ربوٰا اور سود ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے۔

۸-مروجّہ لاٹری

حالیہ زمانے میں بازار کے اندر لاٹری کی مختلف صورتیں مروج ہیں، جن میں سے ایک مشہور صورت یہ ہے کہ بازاروں میں مخصوص جگہ پر لاٹری کی مختلف ٹکٹیں، مختلف قیمتوں میں فروخت ہوتی ہیں، خریدار کسی ایک قیمت یا الگ الگ قیمتوں کے کچھ ٹکٹ خرید لیتا ہے، پھر جب خریدار کا ریکارڈ اصل مرکز میں پہنچتا ہے، اور اس کے نام لاٹری نکل آتی ہے تو اسے متعینہ رقم ملتی ہے، جو اکثر اوقات روپیہ ہی کی صورت میں ہوتی ہے، اور ٹکٹ کی رقم سے زیادہ ہی ہوتی ہے، یہ سود ہے جو شرعاً حرام ہے، نیز اس میں نفع ونقصان مبہم اور خطرے میں رہتا ہے، کہ نام نکل آیا تو نفع ہوگا، اور اگر نہ نکلا تو اصل پونجی بھی ڈوب

جائے گی، علاوہ ازیں یہ ٹکٹ خریدنے والے کی محنت کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ محض بَخت (قسمت) واتفاق پر مبنی ہوتا ہے کہ اس کا نام نکل بھی سکتا ہے اور نہیں بھی نکل سکتا ہے، ایسے ہی مبہم اور پر خطر نفع ونقصان کو قمار کہتے ہیں، جو شرعاً ناجائز وحرام ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کا وہ طبقہ جو ملازمت کرتا ہے، خواہ وہ حکومت کے ملازم ہوں یا کسی نجی وپرائیویٹ کمپنی کے، وہ اپنی ملازمت کے اوقات کی پابندی نہیں کرتے، اوقاتِ ملازمت میں دیانت داری وایمانداری کے ساتھ اپنے مفوضہ کاموں کو انجام نہیں دیتے، جب کہ انہیں جو تنخواہیں دی جارہی ہیں، وہ ان کی خدمات کا ہی عوض ہیں، تو وہ اپنی تنخواہوں کی محض اتنی ہی مقدار کے حقدار ہیں جس کے مقابل انہوں نے خدمات انجام دی ہیں، وہ مقدار جس کے مقابل خدمات انجام نہیں دی گئیں، اس کے وہ حقدار نہیں، تو تنخواہوں کا وہ حصہ حلال کہاں ہوا، جب کہ اس کو حلال سمجھ کر استعمال کیا جارہا ہے، یہی کچھ حال ادارہ اور کمپنیوں کے ذمہ داروں کا ہے کہ وہ ملازمین سے بھرپور خدمات وصول کرتے ہیں اور خدمات کے عوض (تنخواہ) کی ادائیگی میں ان کا استحصال کرتے ہیں، تو روپیوں کی وہ قدر جو انہوں نے اپنے ملازمین کا استحصال کرکے پسِ پشت ڈال دی، وہ ان کے لیے کیسے حلال ہوگی!!

اب رہا عام مسلمان جو نہ تاجر ہے اور نہ ملازم؛ بلکہ وہ محنت ومزدوری کرکے یا کھیتی باڑی کرکے، یا مال مویشی کے ذریعے اپنے گھر کے اخراجات پورے کرتا ہے، اس کے پاس بھی حلال وحرام کی تمیز باقی نہیں رہی، یا ہے بھی تو وہ اس کا پاس ولحاظ نہیں کرتا، ایسا لگتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی وہ بالکل آچکا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ آدمی اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ اس نے جو لیا وہ حلال ہے یا حرام"۔ (بخاری، ۲/ ۸۴۲، مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو کسبِ حلال کی فکر کی توفیق سے نوازیں؛ تاکہ دنیا میں آفتوں اور پریشانیوں سے حفاظت اور آخرت میں نجاح وفلاح نصیب ہو۔ (آمین)

حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیریؒ کا

نثری بیانیہ

مفتی عبید انور شاہ قیصر
استاذ جامعہ ہذا

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبرئیل

آج کے اس مشینی دور میں جب ایک انسان کا رشتہ دوسرے انسان سے دن بہ دن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ احساس اور جذبات سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ چہروں کی رونق اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ رہی ہے۔ زندگی کی حرارت اور سانسوں کی گرماہٹ مفقود ہو رہی ہے۔ رگوں میں کہنے کو لہو دوڑ رہا ہے لیکن آنکھ سے آنسو کا رشتہ ختم ہو چکا ہے، ایسے بے حس دور اور بے ضمیر زمانے میں اگر کسی قلم پارہ کو پڑھنے سے عالمِ جذبات اتھل پتھل ہونے لگے اور دل کی دنیا میں مد و جزر پیدا ہو جائے، مردہ ضمیر کو حیاتِ نو مل جائے، چہرے پر تازگی، آنکھوں میں نور اور سینے میں امنگ پیدا ہو جائے، مطلعِ زندگی پر نئے شمس و قمر جلوہ افروز ہوں اور عقل و شعور کے افق پر نئی روشنیاں نمودار ہونے لگیں، تو ایسے قلم پارہ کو معجزۂ فن اور ایسے صاحبِ قلم کو صاحبِ کرامت کہنا چاہیے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم نے ایسی صاحبِ کرامت شخصیت کو بہت قریب سے دیکھا، ان کے قلم پاروں کو بار بار پڑھا اور ہر مرتبہ ان کے اعجاز کی گواہی دی۔ یہ شخصیت ہمارے ممدوح حضرت فخر المحدثین مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ زبان و قلم کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ تھے، انہیں انشاء پردازی اور مضمون نگاری میں وہ کمال حاصل تھا کہ لفظ و معانی ان کی چاکری کرتے نظر آتے اور فصاحت و بلاغت ان کی بارگاہ میں شرفِ باریابی کے لیے دست بستہ دکھائی دیتے۔ کچھ لکھنے والے عمدہ فکر کے حامل ہوتے ہیں مگر اپنی بات پیش کرنے کا سلیقہ اور موزوں الفاظ ان کے پاس نہیں ہوتے اور کچھ وہ ہیں جن کے یہاں لفظوں کے الٹ پھیر کے سوا کچھ نہیں، ان کا دامن علم و فکر کی دولت سے یکسر خالی ہوتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جن کے یہاں قال بھی ہے حال بھی، طرزِ ادا کے حسن کے ساتھ معنی

آفرینی اور گہرائی بھی۔حضرت شاہ صاحبؒ انہیں معدودے چندلوگوں میں تھے، وہ صاحبِ اسلوب نثر نگار اور بالغ النظر عالم ومفکر تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر وجدان وعرفان، جذب وکیف، علم وآگہی، انفس اور آفاق، فن اور فنکار کے امتیاز کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے طرزِ نگارش میں وادیٔ بطحاء کی تکبیر اور فاران کی اذان ہے۔ اس میں کوثر وتسنیم کی پاکیزگی اور سلسبیل کی مٹھاس ہے۔ یہ حسنِ ماضی کی صدا اور روشن مستقبل کا عنوان ہے، اس میں آتشِ رفتہ کا نشان اور نئی تمازتوں کا سراغ ہے۔ ان کے قلم پاروں میں حکایتِ جنوں بھی ہے عرفانِ ذات کا فسوں بھی، سازِ کائنات بھی سوزِ اندروں بھی، خرد کا جلال بھی جمالِ ضربِ ہُو بھی، غیر فانی یقین بھی پیہم جستجو بھی، وسعتِ اقطاب بھی رفعتِ گردوں بھی، تمکنت کا سرور بھی سیماب کا ظہور بھی، شمعِ خیال بھی چراغِ شعور بھی، شورشِ عندلیب بھی رمز اور سکوت بھی، شرابِ طہور کا لطف بھی نشۂ جام وصبو بھی، خونِ جگر کی آمیزش بھی معجزۂ فن کی نمود بھی، تابشِ گفتار بھی دانشِ افکار بھی، اسرارِ خودی بھی اور رموزِ بےخودی بھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اسلوبِ تحریر کی شناخت اس کے خطیبانہ لب ولہجہ سے ہے۔ ان کا انداز اس قدر پُرشکوہ ہے کہ اس پر کسی فرماں روائے مملکت کے حکمِ شاہی کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی تحریر کا پرجوش آہنگ ہر قاری کو اپیل کرتا اور شعور سے ہوتا ہوا لاشعور کی سطح کو چھولیتا ہے۔ ان کی نثر میں وہ قوتِ تاثیر ہے جو بہت کم اہلِ قلم کو نصیب ہوتی ہے۔ معنوی خوبیوں اور علمی مواد سے ہٹ کر ان کی نثر کی ساخت اور ہیئت کچھ اس قسم کی ہے کہ پڑھنے والے کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ آپ بالکل خالی الذہن ہوں اور سرسری طور پر ہی ان کی کسی تحریر کو پڑھنا شروع کر دیں تو آپ کا ذہن خود بہ خود ایک ارتعاش محسوس کرنے لگے گا اور سرشاری کی کیفیت آپ پر طاری ہو جائے گی۔ پھر یہ قاری کی استعداد و مذاق پر موقوف ہے کہ وہ حسنِ ظاہری ہی کو سب کچھ سمجھ کر اس سے اپنے ادبی ذوق اور وجدان کی تسکین کا کام لیتا ہے یا اس حسن سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس کے پردے میں مستور علم وحکمت کے نگینوں اور حقائق ومعارف کے خزینوں سے بھی اپنے دامنِ مراد کو بھرتا ہے۔

اردو کے معروف نقاد اور صاحبِ قلم حقانی القاسمی کے بقول:

’’انظر شاہ کشمیریؒ کی نثر میں طلسمی کیفیت ہے۔ اردو میں ایسی پُردم اور بلند آہنگ نثر لکھنے والے کم ہیں، جن کے جملوں کے زیر وبم اور موسیقیت سے وہ اذہان بھی متاثر ہوتے ہیں جو لفظوں کے معانی و مفاہیم تک رسائی سے قاصر ہیں۔ ان کی نثر کی رمزیت اور اسراریت میں وہ کیفیت ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا اور اس کا ذہنی وجود نثر کی موجِ رواں میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے۔‘‘ (دارالعلوم دیوبند

:ادبی شناخت نامہ، ص:78-79)

آگے بڑھنے سے پہلے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحریر کے کچھ نمونے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:

''اسلام نہ سائنس کا مخالف ہے نہ جدید علوم سے اس کا کوئی تزاحم، ایک زمانہ تھا پا پیادہ اسفار ہوتے، وقت نے کروٹ لی، بیل گاڑیاں سواری کی شکل اختیار کر گئیں، دنیا نے قدم آگے بڑھائے کار، ریل، تیز رفتار گاڑیاں، ہوائی جہاز، خدا جانے کتنی چیزیں وجود میں آگئیں، ثقہ عالم مستند اربابِ ولایت سب ہی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے رہے، قدیم دور میں تیل کے چراغ جلتے، بعض علاقوں میں درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر شمع کی شکل میں روشن کی جاتیں، لیمپ آئے، لالٹین آئیں اور اب بجلی، بجلی کی بھی بہت سی اقسام جن سے ہر ایک فائدہ اٹھا رہا ہے، یہ تو الزام ہے کہ علماء ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر اسی کو اختیار کر لیتے ہیں، مجھے اس کا انکار نہیں کہ بعض غلو میں مبتلا یا زاہد خشک پہلے تھوتھو کرتے ہیں، پھر حلوۂ شیریں سمجھ کر نگل جاتے ہیں، لیکن جن کے پاس علمِ صحیح ہے انہوں نے یہ انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔'' (ماہنامہ محدثِ عصر، ستمبر/اکتوبر، 2006ء)

حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ پر لکھے مضمون کا البیلا آغاز دیکھیے: ''علمائے روزگار کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن، نامور شخصیتوں کا مرجع، علوم وفنون کا مرکز، اے خوش نصیب دارالعلوم مبدأِ فیاض نے تجھے کن کن گوہر ولآلی سے نوازا اور کیسے کیسے آبدار وتابدار موتیوں سے تیرا دامن لبریز ہے، تو صبحِ چمن ہے کہ بادِ نسیم تیری روشوں پر مصروفِ خرام، تو ایسا صدا بہار گلشن ہے کہ تیرے پھولوں کا منھ دھلانے کے لیے شبنم بلندیوں سے اترتی ہے، یہ زبان استعارہ وتشبیہ کی ہے، ورنہ تیرے لیے سب کچھ وہ فخر روزگار شخصیتیں ہیں جن کی نظیر اب چشمِ فلک دیکھ نہ سکے گی۔'' (لالہ وگل، ص 107)

مشہور سیاسی لیڈر آنجہانی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بوڑھے اور جوان جذبات ہمیشہ سے دست وگریباں رہے، بوڑھے جوانوں کے ساتھ تیز گامی نہیں دکھا سکتے اور جوان بوڑھوں کے ساتھ خراماں خراماں نہیں چل سکتے، اُن کا سینہ جذبات کا شور انگیز دریا اور اِن کا افسردہ جذبات کا مرقد اور فشردہ ہمتوں کا مقبرہ، جوانوں کا طبقہ شبابی ولولوں کا مرقع، اور بوڑھوں کا گروہ ناتوانی اور زبوں ہمتی کا مزارِ حسرت، گھروں، خاندانوں، قبیلوں، قوموں، جماعتوں ہر جگہ حرارت و برودت، آگ اور پانی کا یہ تصادم نظر آئے گا۔'' (لالہ وگل، ص 333)

حضرت شاہ صاحبؒ کی نثر جہانِ اردو کی ایک منفرد نثر ہے، اس میں فکر ونظر کا جمال، عمیق وعمیم مطالعہ کا کمال، مقصد آفرینی، عقلیت و روحانیت اور جذب وتخیل کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں اردو

زبان کا فطری حسن، موسیقی، غنائیت، سرمستی، سحر انگیزی الہام و اعجاز کی حدود کو پہنچتے ہیں۔ ان کے جملوں کے زیر و بم میں نقرئی گھنٹیوں کی نغمگی اور پہاڑی سے گرتے ہوئے آبشار کا سریلا پن، پاکیزگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کے قلم سے نکلتے ساز پر الفاظ رقص کرتے اور طیورِ معانی نغمہ سنج ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے رُبابِ قلم سے ماورائے عالم کے لاہوتی نغمات کو وجود بخشا اور لافانی گیتوں کو زندگی دی۔

مشہور عالمِ دین اور اردو کے ممتاز ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی نظر میں:

''تحریر اُن (مولانا انظر شاہ رحمہ اللہ) کی اتنی اجلی، اتنی پاکیزہ، اتنی صاف شفاف، اتنی رسیلی، اتنی میٹھی، اتنی شیریں کہ خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ اپنا لطف کھو بیٹھے، اتنی پرشکوہ، اتنی جاذبِ نظر کہ ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا سحر ٹوٹتا نظر آئے، عمق اور بلندی اس درجہ کہ مناظر احسن گیلانی کی تحریروں کی چاشنی ذائقہ کا حصہ بن جائے۔'' (میرے عہد کے لوگ، ص 117)

ہم نے متعدد اہلِ قلم کو پڑھا اور ہمارے مشاہدہ میں آیا کہ کئی بلند پایہ قلم کاروں کا رنگ اور ان کی عظمت کا راز ایک یا چند موضوعات سے مخصوص ہے۔ اس خاص موضوع پر لکھتے وقت ان کا قلم سرپٹ دوڑتا اور بلا کی روانی و مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اگر کسی اور موضوع پر لکھنے کے لیے ان سے کہا جائے تو قلم کی حرکت پر بندش لگ جاتی اور سارا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی پسند اور دلچسپی جدا ہوتی ہے نیز بیشتر اوقات مطالعہ محدود ہوتا ہے، اس میں ہمہ جہتی شان نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس تعلق سے بالکل منفرد تھے، انشاء پردازی کی بے مثال قدرت، مطالعہ کی ہمہ گیریت اور فطری ذہانت کے باوصف ان کے لیے ہر موضوع پر لکھنا آسان تھا۔ ان کا چمنستانِ قلم صدا بہار تھا جہاں خزاں کا گزر نہیں تھا۔ انہوں نے مسلسل نصف صدی سے زائد عرصے تک ہر موضوع اور ہر عنوان پر خامہ فرسائی کی، دینی، علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی وغیرہ سب طرح کے مضامین لکھے اور ہر جگہ اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ جس عنوان پر لکھتے معلومات کے دریا بہادیتے اور ادبیت کا جادو ہر سطر سے عیاں ہوتا۔ ان اقتباسات سے شاہ صاحبؒ کے زورِ قلم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''مجلّہ قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا اور ماہِ رمضان ان کے دروازوں پر مصروفِ دستک، یہ ماہ اپنی برکات، ثمرات کے اعتبار سے کشت زارِ ایمان میں نمناک جھونکا اور ایمان کی شادابی کا مبارک مہینہ ہے، یہی وہ ماہِ مقدس ہے جس کے لئے اہلِ ایمان سراپائے انتظار اور اس کی آمد آمد، دلوں کی کھیتیوں کو لہلہانے کے لئے حیات بخش جھونکے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ ماہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے، وہ قرآن جس نے ایمان کی جڑیں مضبوط کیں، دنیا کو امن و امان کا پیغام دیا، زندگی کا ڈھنگ متعین کیا، معاشرہ کو صحیح سمت دی، انسان کو

انسان بننے کی تلقین کی اور بے لگام انسانیت کو مضبوط تکمیل دی، جو دنیا کے لئے پیغامِ ازلی، پیامِ سرمدی ہے۔''(ماہنامہ محدثِ عصر، ستمبر/ اکتوبر، 2003ء)

جناب قاری ابوالحسن صاحب مدظلہ سابق شیخ القراء دارالعلوم دیوبند کی طلب وگزارش پر حضرت شاہ صاحب نے مولانا ارشاد صاحب رحمہ اللہ، مبلغ دارالعلوم دیوبند پر ایک مضمون لکھا اور قاری صاحب کے سپرد کردیا، بعد میں اشاعت سے قبل ہی وہ مضمون قاری صاحب سے گم ہوگیا، انہوں نے اپنے دیرینہ تعلق کی بنیاد پر بے تکلف حضرت شاہ صاحبؒ سے دوبارہ مضمون کی فرمائش کی، شاہ صاحبؒ نے نیا مضمون لکھا اور عنوان قائم کیا ''تعمیلِ ارشاد''، جس میں مولانا ارشاد صاحب کی جانب بھی اشارہ ہے اور مضمون کی اس مکرّر فرمائش پر ہلکا سا طنز بھی، اس مضمون کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''وارداتِ عشق کے ہوں یا عام حالات کے، ذائقہ شناس ہی ان سب کیفیات کو جان سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، ''صحرائے نجد'' کی وحشت سامانیوں کی لذت قیسؔ سے پوچھئے، کوہِ بے ستون کے چیرنے پھاڑنے کا لطف فرہادؔ ہی بتا سکتا ہے، فلسفے کی موشگافیوں اور اس میں حظ سے رازؔی ہی آشنا ہے، سلوک و عرفان میں نکتہ آفرینیاں مولائے رومؔ کا حصہ ہے، ان سب چیزوں کو وہی سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں، رہے ہم اور آپ تو حال ہمارا یہ ہے کہ ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا، نہ سمجھانے کا

کیفیات سے واقفیت کی اہمیت شارع نے بھی خوب سمجھی، چنانچہ فقر و فاقہ میں کرب و بے چینی کا احساس روزے سے پیدا ہوگیا، عشق کے جنون سامانیوں کی فراہمی حج کے فریضے سے کی گئی، یہ بات اگر سمجھ میں آگئی تو ذرا سوچئے کہ کیا گزری ہوگی اس مضمون نگار پر جس نے خونِ جگر سے مضمون لکھا اور طالبِ مضمون نے سالہا سال کے بعد بے تکلف کہہ دیا کہ ''مضمون آپ کا ضائع ہوگیا''، ستم بالائے ستم بلکہ جرات وجسارت کی انتہاء کہ دوسرے مضمون کی فرمائش اسی موضوع پر۔''(لالہ وگل، ص348)

یہ بات سچ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ الفاظ، تراکیب اور جملے بھی کثرتِ استعمال کی بنا پر پژ مردگی اور ناتوانی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ کسی اچھوتے خیال کے تحمل سے یہ عاجز ہوجاتے اور معنی آفرینی کی راہ میں بےسدھ اور بےدم ہوکر گر جاتے ہیں۔ اس صورت میں احساسات وخیالات، تصورات وتخیلات، جذبات اور نت نئے مشاہدات کی حسنِ ادائیگی دشوار ہوجاتی ہے۔ اس آشوب ناک صورت حال سے کوئی کامل فن کار، شاعر یا نثر نگار ہی نبرد آزما ہوسکتا اور اس خلا کو پر سکتا ہے۔ وہ اپنی بے مثال تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر احیاءِ زبان کا عظیم کارنامہ انجام دیتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی نثر ان کی اس تخلیقی صلاحیت کا

مظہرِ اتم ہے اوران کی نگارشات اس عظیم کارنامہ کا منھ بولتا ثبوت ہیں، بالخصوص ان کی تصانیف ''نقشِ دوام''، ''لالہ وگل'' اردو زبان وادب کی عہد آفریں کتابیں ہیں، جو سحر انگیز انشاء پردازی کے ساتھ علمیت اور دانائی کے بیش بہا موتیوں سے مملو ہیں۔ الفاظ وتراکیب کا تنوع اور دوشیزگی، ان کا برمحل وبرجستہ استعمال شاہ صاحبؒ کی فنکارانہ چابکدستی، ذہنی استحضار اور تخلیقِ فن کے سلسلے میں بصیرت، سلیقہ مندی، غیر معمولی ردوقدح اور انتخاب کی صلاحیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس تعلق سے یہ مضمون ملاحظہ ہو، رمز واشارہ، کنایہ اور استعارہ کا کیا خوب اور شگفتہ استعمال کیا ہے، کیا رنگ ہے، کیا آہنگ ہے، اور کیا انداز ہے:

''زندگی انسان کی ہے مانند مرغِ خوش نوا شاخ پر بیٹھا چہچہایا، کوئی دم میں اڑ گیا

فانی زندگی جلوۂ صد رنگ کی حامل اور اپنے پیچھے غم واندوہ رنج والم کی عبرت خیز داستان چھوڑنے والی ہے، یومِ پیدائش سے تا اجل مسمی ہر گھڑی الوداع کے نعرے سناتی ہے اور رخصت رخصت کی صدائیں، یہ غافل انسان کیا سوچتا ہے؟ کیا سمجھتا ہے؟ اس کا وہی حال ہے ؎

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو کوئی کام آغاز بڑا ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

پھر بھی اس فانی کائنات میں بعض ایسی برگزیدہ شخصیتوں کا بھی سانحہ پیش آتا ہے جن کی حیاتِ ناسوتی کا ہر لمحہ دوسروں کے لئے درسِ ہدایت اور سبق عبرت خیز تھا۔ حضرت مولانا اکبر علی صاحب سلہٹی المعروف بہ ''امام صاحب'' ان ہی نفوس قدسیہ میں سے تھے کہ بظاہر مجموعہ استخواں لیکن ہر نفس آتشیں، دیکھنے میں مرزا پھویا، لیکن بباطن شعلۂ جوالا، تقریباً تیس سال گزرتے ہیں کہ سلہٹ میں پہلی ملاقات اور سنت چودھریؒ کے دسترخوان کرم پر شرفِ ہم طعامی، کچھ بزرگوں کے واقعات زیرِ گفتگو آئے تو موصوف نے زور سے نعرہ لگایا، میں گھبرایا لیکن چند ہی لحظات میں صورتحال کو بھانپ لیا کہ مولانا اپنے آتش دان سینہ سے وقفہ وقفہ سے انگارے پھینکتے ہیں اور یہ سلسلۂ تھانویت کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کوئی ''آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد'' کا منظر اور کچھ ''روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہم کو رلائے کیوں'' کا نظارہ۔ مولانا کی پوری زندگی دیوارِ گریہ کا مرقعہ اور گریہ یعقوب کا تسلسل تھا، **من حیث لا یحتسب** ملتا اور بے دریغ لٹاتے۔'' (ماہنامہ محدثِ عصر، جنوری/فروری، 2007ء)

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں لفظی رعایات، نادر ترکیبات، جملوں اور فقروں کے درمیان صوتیاتی، صرفی ونحوی تلازمات اور مناسبات، مرصع کاری، توازن اور آراستگی پائی جاتی ہے۔ اردو کی قدیم وجدید اور تازہ ومنفرد تراکیب کے ساتھ عربی وفارسی الفاظ اس طرح

شامل ہو جاتے ہیں کہ لطف دو بالا ہو جاتا اور رونق ہزار گنا بڑھ جاتی ہے۔ان کے یہاں مفاہیم کی اس کثرت سے آمد ہوتی ہے کہ ان کی ادائیگی کے لئے تراکیب اور الفاظ تنگ پڑ جاتے ہیں، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کے آبگینے ان کے تخیل کی چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ ؎

تنگیٔ ہیئت سے ٹکراتا ہوا جوشِ مواد شاعری کا لطف آجاتا ہے چھوٹی بحر میں

وہ بلا تکلف مسجع و مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں جس میں اس بلا کی روانی، سلاست، والہانہ سرمستی، حرکت و عمل، قوت و توانائی ہوتی ہے کہ گویا وہ نثر میں شاعری کر رہے ہیں۔شاعری سے یاد آیا کہ مشہور جزائری شاعر اور ''کتاب العمدۃ'' جیسی معرکۃ الآراء کتاب کے مصنّف ابن رشیق نے کہا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے کہ جس کو سن کر سننے والے کو یہ خیال ہو کہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن جب کہنے کا ارادہ کرے تو وہ بے بس ہو جائے، یہ تعریف ہم اچھی نثر کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں کامل اذعان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ کی نثر اچھی بلکہ بہت اچھی ہے۔ایک دو نہیں درجنوں لوگوں نے خطابت کی طرح نثر میں بھی ان کے اسلوب اور انداز کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن چند قدم چل کر تھک گئے اور راستے کی مشکلات کے سامنے سپر ڈال دی۔شاہ صاحبؒ نے جس سلیس اور فصیح بلیغ زبان میں مختلف النوع مضامین قلم بند کئے ہیں ان کو پڑھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ مشکل سے مشکل مضمون، خشک ترین عنوان اور دقیق مسائل کو بھی رنگین، شیریں، حلاوت و لطافت اور والہانہ کیف سے بھرپور زبان میں ادا کرنا ممکن ہے۔ عنوان خواہ دینی ہو یا سیاسی، تاریخی ہو یا ادبی، ثقافتی ہو یا سوانحی ان کے قلم کی رنگینی و سنجیدگی قائم و دائم رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی لکھی ہر سطر میں طرفگی ہوتی ہے اور ان کا لکھا ہر صفحہ صحیفۂ کائنات کا منظر پیش کرتا ہے۔شاہ صاحبؒ اپنی مخصوص لفظیات سے محض فقروں کی آرائش و زیبائش کا کام نہیں لیتے بلکہ ترسیلِ معانی و ابلاغِ مطالب کے اہم مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔رعایتِ لفظی کے ساتھ رعایتِ معانی میں وہ اپنے معاصرین کے درمیان بجا طور پر ممتاز ہیں۔وہ اپنے مضامین میں جن نکات کو پروتے اور جو فوائد ذکر کرتے ہیں وہ بآسانی کہیں نہیں ملتے، قدرت کے خزانۂ غیب سے انہیں وہ فکر رسا اور عمیق نظر عطا ہوئی تھی کہ ان کی نگاہ ان گوشوں اور گہرائیوں کو دیکھ لیتی جن تک رسائی سے دوسروں کی نگاہیں محروم رہتی تھیں۔ ان کے مضامین پر غالب کا یہ مصرع مکمل صادق آتا ہے ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک بڑی خوبی ان کی حق بیانی ہے، جو ان کی زندگی اور تقریر و تحریر کا جزو لازم ہے۔شاید اردو کے ماہرین و نقاد حق بیانی کو کسی قلم پارہ کے ادبی محاسن میں شمار نہ کریں، لیکن ہمارے

نزدیک یہ کسی بھی قلم کار کی سب سے بڑی خوبی ہے، پھر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سچ اگرچہ کڑوا ہوتا ہے مگر اس کا اپنا ایک حسن ہے، اس کا اپنا مزہ اور اپنی عظمت ہے۔ جو تحریریں سچ پر مبنی ہوتی ہیں ان میں تابندگی ہوتی ہے اور انہی کے لیے بقاء کی ضمانت ہے۔ شاہ صاحبؒ اپنی حق شناسی وحق بیانی کی پاداش میں کئی بار مطعون ہوئے لیکن انہوں نے اپنا انداز اور روش نہیں بدلی۔ جو دیکھا، جیسا دیکھا، اسی طرح بیان کیا، جس بات کو حق سمجھا اس کے اظہار میں ادنیٰ تامل کیا نہ کبھی کسی ملامت کی پرواہ کی اور نہ کسی مصلحت انگیزی کا شکار ہوئے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

شاہ صاحبؒ مدت العمر کانگریس سے وابستہ رہے، پارٹی کے بڑے لیڈران سے ان کے قریبی تعلقات تھے، لیکن اس تعلق اور قدیم وابستگی کے باوجود جب کبھی ضرورت پیش آئی انہوں نے کھلے الفاظ میں پارٹی کے ذمہ داران پر تنقید کی اور ان کے فیصلوں اور اقدامات کی پرزور مذمت کی، انہیں کبھی کسی عہدے کا لالچ نہیں رہا اس لیے ان کا قلم وزبان حق گوئی سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اپنے ایک مضمون میں برسر اقتدار پارٹی کو اس لب ولہجہ میں مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

''رہی کانگریس تو دونوں ہاتھ میں لڈو رکھنا چاہتی ہے، اکثریت کا بھی اور اقلیت کا بھی اور نتیجہ ایک لڈو بھی ہاتھ میں نہیں رہتا، بلکہ بعد از نتائج مودی ایسے قاتلوں کو دودھ پلا کر پرورش کرتی ہے، اس کی مذہب بیزاری رسوائے عالم، حالاں کہ الیکشن پر انہیں ریش درازوں سے کام لیتی ہے، جنہیں اژدہے باور کرتی ہے۔ کانگریس جب زوال میں آتی ہے تو ریشۂ خطمی، جب اقتدار میں ہو تو فضائے کبر وغرور میں اس قدر مائل بہ پرواز کہ اونچائی پر پہنچنے کے لئے اپنے آہنی بازو بھی کھول دیتی ہے۔

مگر کیا کیا جائے کہ الیکشن آتا ہے تو بہت سے شاہی امام بلکہ کرزئی صفت اس کے لیے مہیا، ان کا کام جس دکانِ سیاست کا شٹر کھلا دیکھتے ہیں اسی میں جا گھستے ہیں، نہ ملّت کا درد نہ ملّت کا غم، نہ وطن کی فکر نہ اسلام کی لاج، بھلا کوئی تک ہے کہ مختار عباس نقوی اور شاہ نواز وغیرہ کی تلواریں ان قاتلین کے ساتھ جو ملت کی گردنیں کاٹنے کے لیے بے تاب۔'' (ماہنامہ محدثِ عصر، اکتوبر 2007ء)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حق بیانی میں اسی طرح شمشیرِ بے نیام نظر آتے ہیں، ان کا یہ طرزِ بیان اہرمن زادوں پر بجلی بن کر گرتا اور مخالفین کے سینوں میں خارِ مغیلاں کی طرح چبھتا ہے۔ انہوں نے سیاست کی مہیب تاریکیوں میں حق گوئی کا چراغ روشن کیا اور ان جگہوں میں بھی اعلانِ حق سے نہیں چوکے

جہاں سچ کہنا بے ادبی اور خاموشی جملہ سعادتوں کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔اس موقع پر احمد فراز کی ایک نظم ذہن پر دستک دے رہی ہے جو شاہ صاحبؒ کی حق پروری کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، اسے شاہ صاحبؒ کی نذر کرتے ہوئے اس گوشے کو سمیٹتے ہیں:

میرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج ، ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی
سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے

تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کج کلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

تم اہلِ حرف کے پندار کے ثناگر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اس قدر تھا کہ دربار سے بلاوا تھا
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمہارے ساتھ ہے کون، آس پاس تو دیکھو
سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا، مرے عدو کے لئے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

میرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کرکے ناز کرے
میرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

میرا قلم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
میرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے

میرا قلم نہیں تسبیح اس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
میرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت میرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں، یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
میرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

شاہ صاحبؒ کی نثر اور اسلوبِ تحریر کا بنظر غائر جائزہ لینے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے زبان کے جمالیاتی وتخلیقی پہلو کے ساتھ اس کے افادی پہلو کا بھی بخوبی لحاظ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں جہاں رمزیہ، علامتی اور شاعرانہ اسلوبِ نگارش کی بہترین مثال ہیں، وہیں اظہارِ خیال کے مقصد کی بھی بھرپور تکمیل کرتی ہیں اور عصری تقاضوں پر بڑی حد تک پورا اترتی ہیں، اس میں شاہ صاحبؒ کی زبان وقلم پر ماہرانہ گرفت اور غیر معمولی لیاقت کا بڑا دخل ہے، ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک پہلو دوسرے پر غالب رہتا ہے، جمالیاتی پہلو کی رعایت پیشِ نظر ہو تو افادی پہلو کمزور پڑ جاتا ہے اور اگر اظہارِ خیال کو اصل مقصود مان لیا جائے تو زبان کی رونق اور اس کا پرشکوہ انداز ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے سے یہ بات بھی بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نثری اسلوب کے لحاظ سے ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں، انہوں نے دنیا جہان کے ادیبوں، قلم کاروں اور مصنفوں کو پڑھا، ان میں سے کئی سے وہ متاثر بھی ہوئے لیکن کبھی کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی، ان کا مزاجِ شاہی اسے گوارہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کسی کی نقل ومحاکات کو اپنا شعار بنائیں۔ انہوں نے اردو کے مخصوص سانچہ میں اپنے منفرد اسلوبِ بیان کے وہ رنگ بھرے کہ ایک انوکھی، دل نشیں، زرفشاں، فلک شکوہ اور الہامی نثر وجود میں آگئی۔ وہ صنائع و بدائع کی تمام انواع واقسام پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور اپنے مضامین میں انہیں اس خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ انسان کے جذبۂ جمال کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کے لیے ان کی تحریروں میں بلا کا جادو اور کشش ہے، جو اسے ابتدا سے انتہاء تک باندھے رکھتے ہیں۔ علمیت اور ادبیت ان کی

تحریروں میں اس طرح باہم دگر آمیز ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ ان کے جملوں کے دروبست سے ابھرتے زمزمے، لفظوں کے درمیان سفر کرتے خوشبو کے قافلے قلب وذہن کو کیف و مستی سے ہمکنار کرتے اوران کی معنویت وتہہ داری چشمِ ادراک کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوتے ہیں۔ درحقیقت شاہ صاحبؒ کا قلم گنجینۂ معانی کا طلسم اورامکانات کا اسمِ اعظم ہے، جس نے ادبیت کی مکمل رعایت کے ساتھ مطالب کے اجنبی جزیروں تک رسائی حاصل کی اور معنویت کے نئے منطقوں اور نئے اَبعاد سے روشناس کرایا ہے۔ رخشِ جبرئیل کی مانندان کے اشہبِ قلم کے قدم جہاں پڑتے ہیں وہ جگہ سبزہ زار ہوجاتی اور مضامین کی سنگلاخ وادیوں میں مفاہیم کے گل بوٹے کھل اٹھتے ہیں۔ ان کی حق پژوہی انہیں ان کے معاصر قلم کاروں سے ممتاز کرتی ہے، اسی کا کرشمہ تھا کہ ان کا قلم تاریکیوں میں اجالوں کا سفیر بن کر رہا جس نے بھڑکتی ہوئی آتشِ نمرود میں رسمِ ابراہیمی ادا کی اور مختلف مواقع پر وہ کارنامے انجام دیے جو میدانِ کارزار میں غازی کی تلوار انجام دیتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کی نثری خوبیوں پر لکھنے کے لئے کئی اہم باتیں ذہن میں ہیں لیکن لکھتے لکھتے ان کی یاد کا زخم تازہ ہوگیا ہے، ان کا سراپا نگاہوں میں گردش کرنے لگا ہے، ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، ان کی ادائیں حافظہ کی سطح پر ایک ایک کر کے ابھر رہی ہیں اور اشاروں کنایوں میں کچھ کہہ رہی ہیں، قلم پر گرفت کمزور پڑتی جارہی ہے اور دل کی کیفیت آگے کچھ لکھنے سے روک رہی ہے، غالب کے ان چند اشعار کے سہارے شاہ صاحبؒ کی قلمی عظمت کو خراجِ عقیدت اور سلام پیش کرتے ہوئے اب اجازت چاہتے ہیں، زندگی رہی تو کسی اور نشست میں اس عنوان پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

فکری تری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کِلک تری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل
تیرے ابہام پر ہوتی ہے تصدّق توضیح
تیرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

❁ ❁ ❁

تقلید یا اصولوں کی پابندی کیوں ضروری ہے؟

جناب محمد مشتاق صاحب
پروفیسر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

تمام فلاسفۂ قانون اور فلاسفۂ اخلاق اس پر متفق ہیں کہ اگر کسی اصول کو آپ ایک جگہ لیتے ہیں اور دوسری جگہ چھوڑتے ہیں تو آپ کی کوئی integrity (دیانت داری) نہیں ہے۔ اسی لیے انگریزی قانون میں precedent (نظیر، نمونہ) کا اصول مانا گیا ہے کہ عدالتیں اپنی مرضی سے فیصلے نہ دیتے پھریں بلکہ قاعدے اور ضابطے کی پابندی کریں تاکہ تعصب اور جانب داری کا امکان ختم کیا جا سکے۔ اسی حقیقت کو اصول فقہ میں اتباعِ ہویٰ اور تشہّی کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض دوست یہاں استحسان کا حوالہ دیتے ہیں لیکن استحسان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مشکل میں پھنس جائیں تو اصول چھوڑ دیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصولی تضاد کو کیسے رفع کیا جائے اور integrity اور analytical consistency کو کیسے یقینی بنایا جائے۔ استعمار و مابعد استعمار کے ادوار میں یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہوا ہے اصول فقہ کے ساتھ کہ استحسان جس کام سے روکنے کے لیے تھا اسی کام کو استحسان کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔

بعض دوست اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دو راستے اختیار کرنے پڑتے تو آسان راستہ اختیار فرماتے۔ یقیناً، لیکن اس آسان راستے کے اختیار کرنے کے بھی تو کچھ قواعد و ضوابط ہیں ورنہ سرے سے تکلیف ہی رفع ہو جائے گی۔ کس کو پڑی ہے کہ فجر کی نماز کے لیے اٹھے، یا جون کے مہینے میں روزے رکھے، یا جان و مال کی قربانی دے؟

رخصتیں یقیناً شریعت نے دی ہیں لیکن عزیمتیں بھی دی ہیں اور رخصتوں اور عزیمتوں کا تعلق بھی واضح کیا ہے۔ بعض دفعہ رخصت پر عمل جائز ہوتا ہے لیکن عزیمت پر عمل بہتر ہوتا ہے؛ بعض دفعہ رخصت پر عمل

واجب ہوتا ہے اور عزیمت پر عمل ناجائز ہوجاتا ہے؛ جبکہ بعض دفعہ رخصت پر عمل جائز ہونے کے باوجود فعل کے کچھ قانونی اثرات ہوتے ہیں اور انسان کی کچھ قانونی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ یہ تفصیلی بحث ہے۔ اس وقت مقصود صرف اس بات کی وضاحت ہے کہ تیسیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کبھی یہ اصول لو اور کبھی وہ۔

سخت سردی میں وضو کے بعد کسی نکسیر پھوٹ گئی تو وہ کہے کہ شافعی فقہ کی رو سے سبیلین کے سوا کسی اور جگہ سے خون کے اخراج سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ پھر اس نے بیوی کو چھوا اور کہا کہ حنفی فقہ کی رو سے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور پھر نماز پڑھی تو یہ نماز حنفی اور شافعی دونوں کے نزدیک ناجائز ہے۔ کسی نے کہا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عاقل و بالغ لڑکی کے نکاح کی صحت کے لیے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے، اور پھر کہا کہ امام مالک کے نزدیک گواہوں کی ضرورت نہیں ہے اور یوں بغیر ولی کی اجازت کے اور بغیر گواہوں کے ایجاب وقبول کیا تو یہ نکاح سب کے نزدیک ناجائز ہوگا۔

اور یہ صرف استثنائی مثالیں نہیں ہیں۔ ''اسلامی بینکاری'' میں جسے ''مرابحہ'' کہتے ہیں وہ فقہائے کرام والا مرابحہ نہیں ہے بلکہ اس کے تین اجزا میں ایک جز و حنفی فقہ سے، ایک شافعی فقہ سے اور ایک مالکی فقہ سے لیا گیا ہے اور مجموعہ سب کے نزدیک غلط ہے!

یہاں اس مسئلے پر بھی بحث ضروری ہوجاتی ہے کہ کسی مخصوص اصولی منہج (جسے عام طور پر فقہی مسلک کہا جاتا ہے) کی پابندی کیوں ضروری ہوتی ہے؟ اس مسئلے کے کئی پہلو ہیں اور عام طور پر لوگ اس میں خلط مبحث میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں، جب فقہائے کرام کا کسی مسئلے پر اختلاف ہو، تو کیا تمام آرا صحیح ہوتی ہیں؟ یا صحیح رائے کوئی ایک ہوتی ہے، اگرچہ دیگر مجتہدین کو بھی اجتہاد کا ثواب بہرحال ملتا ہے؟ دیگر مذاہب کی، یا معاصر اہلِ علم کی، اس موضوع پر جو بھی رائے ہو، حنفی فقہائے کرام کا اصول یہ ہے کہ صحیح رائے ایک ہی ہوتی ہے۔ فلاسفۂ قانون میں ایک بہت بڑا نام رونالڈ ڈوورکن (Ronald Dworkin) کا ہے۔ انھوں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ جہاں بظاہر قانون ''خاموش'' ہوتا ہے، وہاں بھی صحیح رائے صرف ایک ہوتی ہے۔ یہ وہ امریکی وضعی قانون کے متعلق کہتے ہیں۔ حنفی فقہائے کرام تو اسلامی قانون کے متعلق یہ موقف رکھتے ہیں کہ وہ کسی معاملے میں خاموش نہیں ہوتا (بس کانوں سے روئی نکالنی پڑتی ہے)۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ''شریعت'' اور ''فقہ'' کی تقسیم غیر اصولی اور غیر عقلی ہے۔ جن احکام کو ''منصوص'' کہا جاتا ہے وہ بھی کسی مجتہد کے اصولوں پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ جسے ''شریعت'' کہا جاتا ہے، وہ ''فہمِ شریعت'' ہی ہوتا ہے۔ اس لیے جب غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ ''شریعت'' کو ''فقہ کے انبار'' سے

نجات دلائی جائے، تو وہ دراصل یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صرف ہماری فقہ (یعنی فہمِ شریعت) مانیں کیوں کہ صحیح رائے صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور ہماری رائے ہی وہ صحیح رائے ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس بحث میں خلطِ مبحث یہاں سے پیدا کیا جاتا ہے کہ میں بحث مفتی اور قاضی کے پہلو سے کر رہا ہوں لیکن کئی اصحابِ علم کو ''مبتلی بہ'' کی فکر پڑ جاتی ہے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ مفتی یا قاضی نے کوئی اصول اپنا لیا ہے تو پھر اس کے لوازمات بھی مان لے اور پھر انھیں ہر مسئلے میں برتے، الا یہ کہ وہ دو مسائل کو ایک دوسرے سے ممیز کر سکے اور بتا سکے کہ کیوں یہ اصول ایک مسئلے میں لاگو ہوتا ہے اور دوسرے میں نہیں۔ (ضمناً عرض ہے کہ اسی کو استحسان کہتے ہیں لیکن کئی لوگ سمجھتے نہیں!) لیکن کئی لوگ اس مسئلے کو مبتلی بہ یا مستفتی کے پہلو سے دیکھ رہے ہیں۔ بھئی مستفتی کی مثال تو بیمار کی سی ہے۔ جس ڈاکٹر پر اسے اعتماد ہو وہ اس سے جا کر علاج کرائے لیکن ڈاکٹر علاج کرے گا تو ایک خاص ضابطے اور قاعدے سے کرے گا۔ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے بنیادی مفروضات ہی الگ ہیں۔ اس لیے اناڑی ڈاکٹر کبھی ایلوپیتھی اور کبھی ہومیوپیتھی سے علاج کر کے مریض کا بیڑا ہی غرق کرے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بہت ہی ماہر اور حاذق طبیب ہو اور اسے دونوں طریقوں میں مہارت حاصل ہو تو وہ کبھی کسی مقام پر دونوں طریق ہائے علاج سے مدد لے لیکن ایسا کرنے سے قبل وہ یہ ضرور یقینی بنائے گا کہ دونوں کے درمیان ہم آہنگی ہو اور وہ ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔ اب ایسے استثنائی مقام کو بنیاد بنا کر ہر کمپاؤنڈر اور عطائی ایلوپیتھی اور ہومیو پیتھی کو ملا کر علاج کرنا شروع کرے، اور اسے معلوم بھی نہ ہو کہ ان طریق ہائے علاج کے تضادات کیا ہیں اور انھیں دور کیسے کیا جا سکتا ہے، تو نتیجہ کیا ہوگا؟

چوتھا پہلو یہ ہے کہ تقلید کے جواز و عدم جواز، یا وجوب و عدم وجوب، پر جو بحث برصغیر میں ایک خاص سیاق میں شروع ہوئی اور اب تک اسی زاویے سے چل رہی ہے، اس بحث کا محور ''عامی کے لیے تقلید کی ضرورت'' ہے۔ کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہے کہ مریض اپنا علاج خود کرنے کے بجائے ڈاکٹر کے پاس جائے اور اس سے علاج کرائے۔ اس پر بجا طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ آدمی کسی خاص ڈاکٹر کے پاس کیوں جائے؟ کسی اور کے پاس کیوں نہ جائے؟ اس کے جو بھی جواب دیے جاتے ہیں ان کا خلاصہ ایک لفظ میں ہے ''سہولت''۔ آپ کے آس پاس سبھی اس ڈاکٹر سے علاج کرا رہے ہیں اور شفایاب بھی ہو رہے ہیں اور آپ بھی بچپن سے ان کے زیر علاج ہیں اور کبھی کوئی مسئلہ ہوا نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر تبدیل نہ کیا جائے۔ لیکن اگر کسی خاص مرض میں اس ڈاکٹر کے علاج میں آپ کو زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی ہو اور آپ کو کسی اور ڈاکٹر کے بارے میں معلوم ہو جائے جو کم تکلیف دے کر آپ کا علاج کر سکتا ہے اور کئی لوگ

اس سے علاج کرا بھی چکے ہیں (تین طلاق کا مسئلہ لے لیجیے)، تو اس ڈاکٹر کے پاس جانے میں کیا قباحت ہے؟ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں آ کر تقلید کی ضرورت کے سارے دلائل دم توڑ دیتے ہیں اور پھر تقلید کے قائلین کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ کہیں کہ بار بار ڈاکٹر تبدیل کرنے سے مرض میں مزید شدت آسکتی ہے، یا بار بار ڈاکٹر تبدیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علاج کرانا ہی نہیں چاہتے!

میں اس مسئلے کو مریض کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ڈاکٹر کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس پہلو سے تقلید کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو کسی چیز کا علم نہ ہو تو آپ اس سے پوچھیں جو جانتا ہے، بلکہ یہاں تقلید سے مراد یہ ہے کہ جب آپ کسی معاملے کا قانونی فیصلہ چند اصولوں کی بنیاد پر کرتے ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ ان اصولوں کی باہمی ہم آہنگی یقینی بنائیں اور پھر ان اصولوں کی پابندی ہر مقام پر کریں۔ اس لحاظ سے تقلید کا مطلب ''اصولوں کو ہم آہنگ بنا کر ان کی پابندی کرنا'' ہے اور تقلید سے انکار کا مطلب ''اصولی تناقضات کی پروا نہ کرنا'' یا ''بے اصولی'' ہے۔ جس نے بھی تقلید پر بحث کرنی ہے تو وہ از راہ کرام اس مفہوم کو مدنظر رکھ کر کرے۔

علمائے کرام کو شاہ صاحبؒ کی نصیحت

فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد انظر شاہ کشمیری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

حضرات علمائے کرام سے بھی کہنا ہے کہ ہر واقعہ پر اس تحقیق کے بغیر کہ حقیقت کیا ہے، شامی کے صفحات کھول دینا یا فتاویٰ عالم گیری کے حوالے، ہوا میں گھونسہ چلانے کے ہم معنی ہے، انھیں چاہیے کہ واقعہ کی صحیح تحقیق کے بعد ہی مطبوعہ فتاویٰ کی ورق گردانی اور اُن کے حوالے دیا کریں۔ میڈیا کی چالاکیوں کو نہ سمجھنا اور بھولے پن کا مظاہرہ، سادگی نہیں سفاہت ہے، جس سے ہر حال میں احتیاط ضروری ہے۔

(ماہ نامہ ''محدثِ عصر، جولائی ۲۰۰۵ء)

سرزمین فلسطین قرآن کریم کی روشنی میں

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

سرزمین فلسطین نہایت مبارک اور محترم جگہ ہے، یہ سرزمین آسمانی پیغامات اور رسالتوں کا منبع اور سرچشمہ رہی ہے، اس سرزمین پر اکثر انبیاء اور رسل آئے ہیں، یہی وہ سرزمین رہی ہے جہاں سے معراج کی ابتداء اور انتہا ہوئی ہے، یہ آسمان کا دروازہ ہے، یہ سرزمین محشر بھی ہے۔

۱۔سرزمین مبارک:

اللہ عزوجل نے سرزمین فلسطین کو خیر و برکت والی زمین فرمایا ہے:، ان جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں دائمی اور ابدی طور پر خیر و برکت قائم و دائم رہے گی، علامہ شوکانیؒ نے برکت کے معنی یہاں کی زراعت اور پھل لئے ہیں، اسی کی پیداوار بہت زیادہ ہوگی، دیگر لوگوں نے برکت سے نہریں، پھل، انبیاء اور صلحاء مراد لئے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس سزمین کے تعلق سے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا ہے: بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (الإسراء: ۱) اس سے مراد ملک شام ہے، سریانی زبان میں ''شام'' کے معنی پاک اور سرسبز زمین کے آتے ہیں، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ملک شام کو مبارک اس لئے کہا گیا کہ یہ انبیاء کا مستقر، ان کا قبلہ اور نزول ملائکہ اور وحی کا مقام رہا ہے، یہیں لوگ روزِ محشر میں جمع کئے جائیں گے، حضرت حسن اور حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اس مبارک سرزمین سے مراد ملک شام ہے،، زید بن اسلم سے مروی ہے کہ اس سے مراد ملک شام گاؤں مراد ہیں، عبداللہ بن شوذب کہتے ہیں، اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے۔

سرزمین فلسطین کو قرآن کریم میں پانچ مواقع سے بابرکت زمین سے مخاطب کیا گیا ہے:

۱۔سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ (الإسراء: ۱)

(پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے۔)

۲۔ ''وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝'' (الأعراف: ۱۳۷)

(اور جن لوگوں کو کمزور سمجھا جاتا تھا، ہم نے انہیں اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنا دیا جس پر ہم نے برکتیں نازل کی تھیں۔ (۱۶) اور بنی اسرائیل کے حق میں تمہارے رب کا کلمہ خیر پورا ہوا، کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔ اور فرعون اور اس کی قوم جو کچھ بناتی چڑھاتی رہی تھی،، اس سب کو ہم نے ملیا میٹ کر دیا۔)

۳۔ ''وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝'' (الأنبياء: ۷۱)

اور ہم نے نجات اسے اور لوط کو اس زمین کی طرف جو (کہ) ہم نے برکت رکھی اس میں تمام جہان والوں کے لیے۔

۴۔ ''وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝'' (الأنبياء: ۸۱)

اور ہم نے تیز چلتی ہوئی ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہمیں ہر بات کا پورا پورا علم ہے۔

۵۔ ''وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝'' (السبا: ۱۸)

اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، ایسی بستیاں بسا رکھی تھیں جو دور سے نظر آتی تھیں، اور ان میں سفر کو نپے تلے مرحلوں میں بانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ ان (بستیوں) کے درمیان راتیں ہوں یا دن، امن وامان کے ساتھ سفر کرو۔

۲۔ مقدس سرزمین

ارض مقدس سے مراد ''ارض مطہر'' (پاک وصاف سرزمین) ہے، راغب کہتے ہیں: بیت المقدس:

یعنی یہ شرک وکفر کی نجاست سے پاک ہے، زجاج کہتے ہیں: ارض مقدس سے مراد دمشق، فلسطین اور اردن کے ہیں، حضرت قتادہ سے مروی ہے: اس سے ملک شام مراد ہے، ابن عسا کر نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ارض مقدس عریش سے فرات تک کی سرزمین کو کہتے ہیں۔ سرزمین فلسطین کو ''ارض مقدس'' صرف قرآن مجید میں ایک جگہ پر کہا گیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

''يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝'' (المائدة: ۲۱)

اے میری قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے واسطے لکھ دی ہے، اور اپنی پشت کے بل پیچھے نہ لوٹو، ورنہ پلٹ کر نامراد جاؤ گے۔

۳۔ سرزمین محشر

اللہ عزوجل نے سرزمین فلسطین کو ''ارض محشر'' اور ''سرزمین محشر'' بھی فرمایا ہے، ارشاد باری عزوجل ہے:

''هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ'' (سورۃ الحشر: ۲)

(وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافر لوگوں کو ان کے گھروں سے پہلے اجتماع کے موقع پر نکال دیا۔) یہاں ''اول حشر'' سے مراد یعنی ان یہودیوں کا ملک شام میں اکٹھا ہونا ہے، جس وقت نبی کریم ﷺ نے بنو نضیر کو سرزمین مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا، زہری سے مروی ہے کہتے ہیں: اول حشر کے طور پر ان کی دنیا میں جلاوطنی سرزمین شام میں ہوئی تھی، ابن زید کہتے ہیں: ''اول حشر'' سے مراد سرزمین شام ہے، ابن عباس سے بکثرت روایات میں منقول ہے کہ فرماتے ہیں: جس کو اس بات میں شک ہو کہ ارض محشر سے مراد سرزمین شام ہے وہ اس آیت کو پڑھے، پھر اس آیت کا آپ ﷺ نے تذکرہ فرمایا۔

۴۔ سرزمین فلسطین بغیر کسی صفات کے تذکرہ:

اس طرح کئی مواقع پر قرآن کریم میں بغیر کسی صفت کے تذکرہ کے سرزمین فلسطین کا بیان واقع ہوا ہے۔

۱۔ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ (الإسراء: ۴)

(اور ہم نے فیصلہ سنا دیا بنی اسرائیل کو کتاب میں (کہ) بلاشبہ ضرور تم فساد کرو گے زمین میں دو مرتبہ اور ضرور بالضرور تم چڑھائی کرو گے بہت بڑی چڑھائی)۔ شوکانی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہاں اس آیت میں سرزمین شام اور بیت المقدس مراد ہے۔

۲۔"وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝" (الأنبياء: ۱۰۵)

(اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہاں ارض مقدسہ سے سرزمین شام اور فسلطین مراد ہے، شوکانی نے بھی ان کی موافقت کی ہے، مجیدالدین حنبلی کا ایک قول یہ ہے: یعنی اس سے مراد سرزمین مقدس (بیت المقدس) جس کے مسلمان امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم وارث ہوں گے۔

۳۔"وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝" (یونس: ۹۳)

(اور ہم نے بنواسرائیل کو ایسی جگہ بسایا جو صحیح معنی میں بسنے کے لائق جگہ تھی، اوران کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ پھرانہوں نے (دن حق کے بارے میں) اس وقت تک اختلاف نہیں کیا جب تک ان کے پاس علم نہیں آ گیا۔ یقین رکھو کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے، ان کا فیصلہ تمہارا پروردگار قیامت کے دن کرے گا)۔ یہاں "مبوأ" سے منزل محمود مراد ہے، یعنی ملک شام کا جنوبی علاقہ فلسطین اس سے مراد ہے۔

۴۔وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ (التین: ۲)

اکثر مفسرین کے یہاں انجیر اور زیتون سے مراد وہ شہر ہیں جہاں ان کی بکثرت زراعت اور پیداوار ہوتی ہے، حضرت کعب سے مروی ہے "التین" سے دمشق اور "زیتون" بیت المقدس مراد ہے، شہر بن حوشب سے مروی ہے فرماتے ہیں: "الزیتون" سے ملک شام مراد ہے۔

۵۔قرآن میں فلسطین کے علاقوں کا تذکرہ:

قرآن کریم نے بعض سرزمین فلسطین کے علاقوں کا بھی تذکرہ کیا ہے:

۱۔"وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ۝" (المؤمنون: ۵۰)۔

(اور مریم کے بیٹے کو اوران کی ماں کو ہم نے ایک نشانی بنایا، اوران دونوں کو ایک ایسی بلندی پر پناہ دی جو ایک پرسکون جگہ تھی، اور جہاں صاف ستھرا پانی بہتا تھا)۔

ابن جریر نے مرہ نہزی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہا "الربوۃ" سے مراد "الرملۃ" ہے۔

ابن عساکر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: اس سے مراد "ربوۃ"، فلسطین کا علاقہ مراد ہے، قتادہ، کعب اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں: اس سے مراد بیت المقدس ہے۔

۲۔ ’’فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا﴿۲۲﴾ ‘‘(مریم: ۲۲)

تو وہ حاملہ ہوگئی اس (بچے) سے پھر وہ الگ ہوگئی اس کے ساتھ ایک دور جگہ (یعنی جنگل) میں۔

مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ حضرت مریم حالت حمل میں دور چلی گئیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وادی اقصی تک گئیں، اور یہی بیت اللحم ہے، اس کے اور ’’ایلیا‘‘ کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے، اور ’’ایلیا‘‘ ’’بیت المقدس‘‘ کا ہی ایک نام ہے۔

۳۔ ’’وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ﴿۴۱﴾ ‘‘(ق: ۴۱)

(اور توجہ سے سنیے جس دن پکارنے والا پکارے گا قریب جگہ سے)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اللہ عز وجل کے اس قول کے بارے میں ارشاد ہے: ’’من مکان قریب‘‘ سے ’’صخرہ‘‘ بیت المقدس مراد ہے، قتادہ کہتے ہیں: ہم کہتے تھے کہ منادی صخرہ بیت المقدس سے آواز لگائے گا، اور کلبی اور کعب فرماتے ہیں: یہ آسمان سے زمین کا قریبی حصہ ہے۔

۴۔ ’’وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۵۸﴾ ‘‘(البقرۃ:۵۸)

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہوجا اور اس جہاں سے چاہو جی بھر کر کھا اور (بستی کے) دروازے میں جھکے سروں سے داخل ہونا اور یہ کہتے جانا کہ (یا اللہ) ہم آپ کی بخشش کے طلب گار ہیں (اس طرح) ہم تمہاری خطائیں معاف کردیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ (ثواب) بھی دیں گے)۔

علماء کے مابین اس گاؤں کی تعیین میں اختلاف ہے، جمہور علماء کا کہنا ہے یہاں ’’قریۃ‘‘ گاؤں سے مراد بیت المقدس ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: یہاں ’’باب‘‘ دروازہ سے مراد بیت المقدس کا ’’باب الحطۃ‘‘ ہے۔

۵۔ ’’اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا‘‘ (البقرۃ: ۲۵۹)

(یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایسے وقت گزر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی؟) قرطبی نے ذکر کیا ہے اس سے مراد وہب بن منبہ اور قتادہ وغیرہ کے قول کے مطابق بیت المقدس ہے، جس وقت اللہ عز وجل نے بخت نصر کے ذریعہ بیت المقدس سے ان کا تخلیہ کرایا تھا، یہ عراق کا والی تھا، شوکانی اور جمہور بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

۶۔ ’’فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ ‘‘(البقرۃ: ۲۴۹)

(چنانچہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: اللہ ایک دریا کے ذریعے تمہارا امتحان لینے والا ہے)۔ قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ یہاں نہر سے مراد اردن اور فلسطین کے درمیان کی نہر ہے، شوکانی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ نہر اردن ہے، ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد نہر فلسطین ہے۔

۷۔ "حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ "(سورۃ النمل: ۱۸)

یہاں تک کہ جب وہ آئے چیونٹیوں کی وادی پر کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو! تم داخل ہو جاؤ اپنے گھروں (بلوں) میں (کہیں) ہرگز کچل نہ دیں تمہیں سلیمان اور اس کا لشکر اس حال میں کہ وہ شعور نہ رکھتے ہوں)۔

امام رازی کہتے ہیں، اس "وادی النمل" سے مراد "وادئ شام" ہے، جہاں چیونٹیوں کی کثرت ہوتی ہے، یہ وادی "عسقلانی" کے پڑوس میں واقع ہے۔

یہ سرزمین جس کے تقدس اور تبرک کا تذکرہ قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، جس کے مسلمانوں کے بطور وارث ہونے کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے، یہ سرزمین مسلمانوں کے یہاں نہایت متبرک اور مقدس گردانی جاتی ہے، لیکن افسوس صد افسوس کہ اس مقدس اور پاک سرزمین پر ناپاک یہودی اپنے قدم جمانے اور اس کو اپنی ملک اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کے ناپاک عزائم بنا چکے ہیں اور منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ساری دنیا میں اس کے خلاف احتجاج جاری ہے، جلسے جلوس ہو رہے ہیں، مسلمانوں کو اس کے تقدس کو سمجھنا چاہئے اور بیت المقدس کی بازیابی کے لئے اور اس پاک سرزمین پر ناپاک قدم پڑنے سے روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

سانحۂ مصر: مری عافیت کے دشمن مجھے چین آ چلا ہے

عمیر کوٹی ندوی

عالم اسلام کے لئے یہ خبر کہ محمد مرسی جو مصر کے پہلے جمہوری طور پر منتخب صدر تھے 17 ؍جون 2019 کو کمرۂ عدالت میں انتقال فرما گئے انتہائی تکلیف دہ ہے۔ مصر کے سرکاری پراسیکیوٹر کے مطابق ان کی موت کا اعلان مقامی وقت کے مطابق 4:50 پر کیا گیا۔ مصری حکومت کے مطابق محمد مرسی کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی جس کی تفصیل یہ بتائی گئی کہ محمد مرسی نے عدالت میں ایک ساؤنڈ پروف پنجرے سے پانچ منٹ تک بات کی، اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر گئے اور اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح مصر پر فوجی بغاوت کے ذریعہ تسلط حاصل کرنے والا طبقہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ گویا محمد مرسی کی موت فطری اور طبعی طور پر ہوئی اور ان پر ظلم وجور کے پہاڑ توڑنے والوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ لیکن ان باتوں اور حربوں کو یہ جملہ غلط ثابت کر رہا ہے کہ "میں برادرم شہید مرسی کی مغفرت کے لئے دعا گو ہوں"۔ یہ کسی عام زبان سے نکلا ہوا جملہ نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کے لئے امید کی کرن، حق گو وحق پسند، امت مسلمہ کے ایک جسم ہونے کے تصور کو زندہ کرنے والی اور عملی طور پر پے در پے اس کا نمونہ پیش کرنے والی شخصیت کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ترکی کے صدر رجب طیب اردگان نے محمد مرسی کی وفات کی خبر کے بعد میڈیا سے بات کرتے ہوئے اس سانحہ پر مصری عوام سے اظہارِ تعزیت کیا۔ ترکی میڈیا کے مطابق ''انہوں نے اس بات کی یاددہانی بھی کرائی کہ مرحوم محمد مرسی کو مصر میں بغاوت کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے والے ظالم عبدالفتاح السیسی نے ان کے ہزارہا ساتھیوں کے ہمراہ سالہا سال سے جیل میں قید کر رکھا تھا''۔

مصری صدر محمد مرسی سن 2012 میں ملک کے پانچویں انتخابات کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے والے پہلے صدر مملکت بنے تھے۔ محمد مرسی نے انتخاب میں کامیابی کے بعد تمام مصریوں کا صدر بننے کے عزم کا

اظہار کیا تھا۔لیکن ان کی اسلام پسندی، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کو جاری وساری کرنے کی فکر کا حامل ہونا جسے مغرب نے Practicing Muslim کا لقب دے رکھا ہے یہ مغرب کی ہی اصطلاح میں Non Practicing Muslim کو ایک آنکھ نہ بھایا۔اس لئے انہوں نے مغرب کے ہی اشاروں پر منتخب حکومت پر "اسلام پسندوں کو سیاسی منظرنامے پر چھا جانے کے مواقع فراہم کرنے'' کے بنیادی الزام کے تحت تختہ پلٹ دیا۔مصر کی فوج نے 30رجون 2013 کو محمد مرسی کو برطرف کر کے انھیں جیل میں بند کر دیا تھا۔اس کام میں اقتدار اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے Non Practicing Muslim ہی نہیں بلکہ عمل سے اسلام بیزار طبقہ نے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے مدد کی۔مصری فوج نے بغاوت کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد سے پرامن اور جمہوری راہ پر چل کر اقتدار تک پہنچنے والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ اب تک چل رہا ہے اور شہید مرسی کا سانحۂ انتقال اسی کا حصہ ہے۔حد تو یہ ہے کہ حسن البناء شہید کی طرح ان کے جسد خاکی کو بھی خاندان کی جانب سے آبائی گاؤں میں تدفین کی درخواست کو ''سیکورٹی خدشات کی بنا پر'' مسترد کرتے ہوئے برسر اقتدار طبقہ کی طرف سے 18رجون کو علی الصبح دارالحکومت قاہرہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

خبر کے مطابق جنازے میں ڈاکٹر محمد مرسی کے دو بیٹوں کے علاوہ صرف وکیل ہی جا سکے۔فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے والے طبقہ نے ان پر "اسلام پسندوں کو سیاسی منظرنامے پر چھا جانے کے مواقع فراہم کرنے'' کے بنیادی الزام کے ساتھ ساتھ جو الزامات عائد کئے ان میں ''اپنے وعدوں پر عمل کرنے میں ناکام رہنا''، ''ملکی معیشت کو اچھی طرح چلانے میں ناکام رہنا''، ''قطر کو دستاویزات فراہم کرنا''، ''ایک غیر قانونی تنظیم (الاخوان المسلمین) کی سربراہی کرنا''، ''فلسطینی جماعت حماس کے ساتھ رابطوں کے حوالے سے جاسوسی'' جیسے بہت سے الزامات شامل تھے۔مؤخر الذکر معاملہ کی سماعت کے دوران ہی ان کی وفات کی خبر برسر اقتدار طبقہ کی طرف سے دی گئی۔ان الزامات میں سے کسی میں انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تو کسی میں عمر قید کی۔غیر قانونی تنظیم (الاخوان المسلمین) کی سربراہی جس کا عدالت نے انہیں مجرم قرار دیا تھا وہ انتخابات سے پہلے اور بعد میں سب پر عیاں تھی۔اس بات کے ساتھ ہی انتخابات کا پورا عمل ہوا، حکومت سازی ہوئی، حکومت نے السیسی سمیت بہت سوں کے متعدد ذمہ داریاں سپرد کیں۔فوج اس حکومت سے مسلسل رابطہ میں رہی، گفت وشنید کے دور پر دور چلتے رہے لیکن پھر ایک وقت میں تختہ پلٹ ہو گیا اور یک لخت رات و دن کے معیار بدل گئے۔حکومت کی ہر سرگرمی جرم قرار پائی اور ہر ذمہ دار مجرم۔اسی کے بعد ظلم وجور کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔اخوان کے سیکڑوں کارکنان کو تشدد آمیز کارروائیوں میں ہلاک کر دیا

گیا، نہ جانے کتنے غائب ہو گئے، ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

محمد مرسی اور الاخوان المسلمین کے 14 دیگر سرکردہ رہنماؤں پر متعدد الزامات کے تحت مقدامات کی سماعت نومبر سنہ 2013 میں شروع ہوئی۔ مقدمہ کی پہلی سماعت پر کٹہرے میں کھڑے محمد مرسی نے چیخ چیخ کر کہا تھا کہ انھیں ''فوجی بغاوت'' کا شکار بنایا گیا ہے۔ انھوں نے اس عدالت کو ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''ملک کے آئین کے مطابق میں جمہوریہ کا صدر ہوں اور مجھے زبردستی قید کیا گیا ہے۔'' 67 سالہ محمد مرسی اپنی معزولی کے بعد سے تادم آخر قید میں ہی تھے۔ اس عرصہ میں انہیں ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے امراض کا علاج کروانے کے لیے مناسب طبی سہولیات مہیا نہیں کی گئیں اور انھیں مسلسل قیدِ تنہائی میں رکھا گیا جہاں انہیں نت نئی صعوبتوں سے دوچار کیا جاتا رہا جو رفتہ رفتہ انہیں کمزور اور موت کے منہ سے قریب کرتی رہیں۔ ان صعوبتوں کے علاوہ سانحۂ وفات بذات خود ایک معمہ اور مشکوک عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الاخوان المسلمین نے محمد مرسی کی موت کو 'قتل' قرار دیا ہے۔ سیکورٹی خدشات کی بنا پر عام لوگوں کو محمد مرسی کے جنازے میں شریک ہونے کے مواقع کا فراہم نہ ہونا حتی کہ اہل خانہ کو بھی اس سے عمومی طور پر نہ صرف دور رکھنا بلکہ ان کے تدفین کے حق کو بھی تلف کر دینا زبان حال سے بہت کچھ کہتا ہے۔ انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے بھی اس پر سوالات اٹھا رہے ہیں اور حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔ بہرکیف مصر کے قانونی سابق صدر شہید محمد مرسی کے سانحہ نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کر دیا ہے کہ دور حاضر میں گرچہ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا لیکن حقیقت میں Practicing Muslim باعمل مسلم ہونا شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ اور سانحۂ وفات ان کے لئے جائے امن کی طرف کوچ کرنا ہے۔ بقول شاعر

مری عافیت کے دشمن مجھے چین آ چلا ہے
کوئی اور زخم تازہ اور کوئی اور ضرب کاری

❁❁❁

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ جامعہ ہذا

جدید وقدیم داخلے

الحمدللہ! ماہِ شوال المکرم کے آغاز ہی میں ۳؍تاریخ کو جامعہ کھل گیا، اور جدید وقدیم داخلے کی کارروائی بھی شروع ہوگئی۔ درجۂ حفظ، درجۂ ناظرہ، درجۂ اعدادیہ، عربی اول تا دورہ حدیث، تکمیلِ ادب اور تکمیل افتاء کے درجات میں داخلے کے خواہش مند طلبہ کا تحریری اور تقریری امتحان لیا اور کامیاب و بااستعداد طلبہ کو داخلہ دیا گیا۔ امسال طلبہ کا رجوع الحمدللہ پہلے سے بھی بڑھ کر رہا۔

۱۷؍شوال المکرم کو قدیم طلبہ بھی آ گئے اور انہوں نے بھی فارم پُر کر کے دفتری کارروائی سے خود کو گزارا۔ تعطیل پر گئے ہوئے اساتذہ بروقت تشریف لے آئے۔

حضراتِ اساتذۂ جامعہ کی تعلیمی نشست

۲۳؍شوال المکرم کو بعد مغرب اساتذۂ جامعہ کی تعلیمی نشست منعقد ہوئی، جس میں رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری مدظلہٗ نے حضرات اساتذہ کو خطاب فرمایا۔ آپ نے اپنی تفصیلی تقریر میں کہا کہ جامعہ کا اصلی تعارف آپ ہی ہیں، اس کی نیک نامیوں اور ترقیات کا سارا سہرا آپ کے سر ہے۔ آپ ہی کے اخلاص، جذبہ اور قربانیوں سے جامعہ یہاں تک پہنچا ہے اور اگلے مراحل بھی آپ ہی کے ذریعے پورے ہوں گے، شاہ صاحب مدظلہٗ نے تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت پر بھی زور دینے کی تلقین کی، آپ نے فرمایا کہ اسلام میں نظم وضبط اور صفائی وستھرائی کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے مدارس میں تعلیم پر زور کے ساتھ تربیت پر بھی توجہ ہو تو ایک کامل مسلمان ہمارے اداروں سے تیار ہوں گے۔

تعلیمی اجلاس کا انعقاد

اگلی صبح ۹؍بجے تعلیمی اجلاس کا انعقاد ہوا، جس میں اساتذہ سمیت سارے طلبہ نے شرکت کی۔ اجلاس

حضرت رئیس الجامعہ مدظلہٗ کی صدارت اور احقر کی نظامت میں منعقد ہوا۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ طلبۂ عزیز! آپ بہت دور دراز کی مسافتیں طے کرکے یہاں آئے ہیں۔ آپ کا مشن صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ خوب محنت کرکے خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سنبھالیں گے۔ آپ کا یہ مشن بڑا عظیم اور مقصد نہایت مبارک ہے۔ آپ اپنے مقصد کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ مقصد فراموشی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ صدر محترم نے اسلاف کی زندگی کو بھی مطالعے میں رکھنے کی تلقین فرمائی۔

اس موقع پر حضراتِ اساتذہ نے بھی طلبۂ عزیز سے قیمتی خطاب فرما۔ جناب مولانا مفتی نثار خالد صاحب کی دعا پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

تعلیم کا آغاز

اجلاس کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ۲۵ رشوال سے جامعہ میں تعلیم کا باقاعدہ آغاز کردیا گیا۔ اساتذۂ کرام کو متعلقہ کتابوں کی فہرست اور ان کی ماہانہ مقدارِ خواندگی کا چارٹ دے دیا گیا اور اس طرح شعبان میں موقوف تعلیمی سرگرمیاں ایک بار پھر جاری ہوگئیں۔

مطبخ کا اجراء

تعلیم کے آغاز کے ساتھ مطبخ بھی جاری ہوگیا۔ مطبخ کے ناظم اعلیٰ محترم جناب قاری بلال احمد چالاک پوری صاحب نامزد کئے گئے ہیں، جب کہ نائب ناظم حسبِ سابق محترم جناب مولانا محمد عثمان غنی دیوبندی رہیں گے۔

بعدِ مغرب کی نگرانی

طلبۂ عزیز کے تعلیمی انہماک کے لئے اوقاتِ درس کی پابندی کے ساتھ بعدِ مغرب کا مطالبہ و مذاکرہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر جامعہ میں بطور خاص نگراں مقرر کئے جاتے ہیں۔ امسال احقر فضیل احمد ناصری نائب ناظم تعلیمات جامعہ ہذا، مولانا مفتی نثار خالد دیناجپوراور مولانا ابوطلحہ اعظمی زید مجدکم کو نگراں مقرر کیا گیا ہے۔ یہ حضرات باقاعدہ طلبہ کی حاضری لیتے اور ان کی سخت نگرانی فرما کر طلبہ کے بہتر مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں۔

بعدِ مغرب کا یہ مذاکرہ و مطالعہ جامعہ کے دارالحدیث تحتانی میں ہوتا ہے، جہاں دورۂ حدیث، حفظ اور ناظرہ کے علاوہ ساری جماعتوں کے طلبہ حلقہ بنا کر بیٹھتے ہیں اور ہر جماعت طلبہ کے ساتھ اپنے سبق کا اعادہ کرتے ہیں انور ہال کے تحتانی حصے میں (جہاں طلبہ مذاکرے کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں) چھ پنکھوں کا

اضافہ بھی کیا گیا ہے تاکہ اضیاف المسلمین کو پڑھنے لکھنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

دورۂ حدیث کے اسباق بعد مغرب مشکوٰۃ کی درس گاہ میں ہوتے ہیں، جسے دارالحدیث فوقانی بھی کہا جاتا ہے۔ حفظ اور ناظرہ کے طلبہ اپنی اپنی درس گاہوں میں اسباق یاد کرتے ہیں۔

موبائل پر پابندی

تعلیمی سفر کرگرم تر رکھنے کے لئے جامعہ میں موبائل پر پابندی ہے۔ تعلیمی اوقات میں طلبہ کسی بھی قسم کا موبائل رکھنے کے مجاز نہیں، اسی طرح مغرب بعد بھی انہیں اجازت نہیں، غیر تعلیمی اوقات میں سادہ موبائل رکھ سکتے ہیں، سادہ موبائل سے مراد وہ موبائل ہے جس میں کیمرہ اور چِپ نہ ہو، تعلیمی اوقات میں کسی بھی قسم کا موبائل پکڑا گیا تو شعبان سے پہلے واپس نہ ہوگا۔ البتہ ملٹی میڈیا موبائل کی کسی بھی صورت میں اجازت نہیں ہے۔

❁❁❁

صبر: رفعِ درجات کا سبب

بعض اوقات بندہ اپنی عبادات کی وجہ سے اللہ ربّ العزت کے قرب کے وہ مقامات نہیں پا سکتا جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر اس کے اوپر کچھ برے حالات بھیج دیتے ہیں۔ جب وہ بندہ ان حالات میں صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سبب بنا کر اس بندے کو بلند مقام عطا فرما دیا کرتے ہیں، چناں چہ روایات میں آیا ہے کہ جب کوئی بیمار آدمی صحت یاب ہوتا ہے تو اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ خزاں کے موسم میں درخت کے پتے گرتے ہیں، اسی طرح بیمار آدمی کے جسم سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو دور کر دیا کرتے ہیں۔

(قلبی صفائی کے لئے روحانی تدابیر، حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی ص: ۲۲۵)



جامعہ میں زیر تعمیر جدید دارالاقامہ کا مجوزہ نقشہ



مسجد انور شاہ



انور ہال



دارالاقامہ کا اندرونی منظر



دارالاقامہ کا بیرونی منظر

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah
A/c No. 520101265117956
Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786